مقدمۃ قرآن

پروفیسر احمد رفیق اختر

سنگ میل پبلی کیشنز○ لاہور

اللہ

بزرگ و برتر کے نام جس نے عقل تخلیق فرمائی
اور اسے حُسنِ منتخب قرار دیا' امانتِ علم و شعور
بخشی اور قدرِ انسان کا باعث فرمایا۔ اس توفیق
کے نام جو اُس نے مجھے بخشی اور اُسی سے
قبولیتِ کاوش کی آرزو ہے۔

ابتدائیہ

یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ نسلِ انسانی کی معلومہ تاریخ کا کوئی دور اللہ کے نفوسِ مقدسہ سے خالی نہیں رہا۔ پروردگار نے انہیں حقیقی علم سے روشناس کر لیا۔ ان برگزیدہ ہستیوں نے پروردگار کی دعوتِ تفکر کو ترجیحِ اول کی حیثیت دی اور خبر ونظر کے اصل روحانی سرچشموں سے سیراب ہو کر مخلوقِ خدا کے لیے خالق کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم کو روشن سے روشن تر کر دیا۔ دورِ حاضر کی ایسی ہی لائق صد احترام ہستیوں میں ایک پروفیسر احمد رفیق اختر صاحب کی ذات گرامی بھی ہے۔

اب تک پروفیسر موصوف کی چند کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں' جو ان کی ریکارڈ کردہ گفتگوؤں پر مشتمل ہیں۔ زیرِ نظر کتاب یعنی ''مقدمۃ القرآن'' ان کی پہلی تصنیف ہے' جو ان کی اپنی تحریر کردہ ہے۔ یوں تو پروفیسر صاحب کی دیگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی ان کی مخصوص طرزِ فکر اور حیات آفریں تعلیمات کی ترجمان ہے' لیکن اس کا اہم ترین پہلو یہ

ہے کہ انہوں نے ۹/۱۱ کے بعد کی عالمی صورتِ حال کے تناظر میں مسلمانوں کو ایک ایسی راہ سُجھائی ہے جس پر اگر وہ ثابت قدمی اور حوصلہ مندی سے گامزن رہے، تو مایوسی اور بے یقینی کے بادل چھٹ جائیں گے۔ یہ کتاب ہر مسلمان کو اس بات کا پختہ یقین دلاتی ہے کہ اگر ہم نے اللہ کی رسّی یعنی قرآن کریم کو مضبوطی سے پکڑے رکھا اور اس کی دعوتِ فکر و عمل کو اپنی اولیں ترجیح کی حیثیت دی، تو پھر تشویش کی کوئی بات نہیں۔ مختصراً یہ کتاب نہ صرف انفرادی طور پر بلکہ پوری امتِ مسلمہ کے لیے ایک پیغام بھی ہے اور درخشاں مستقبل کی نوید بھی۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ مذہب عادت ہے یا انتخاب۔ بے شمار لوگ مذہبی ہیں۔ وہ بھی جو لامذہب ہیں، کسی نہ کسی معقول و غیر معقول پر اعتبار رکھتے ہیں۔ ارنسٹ ہیمنگوے (Ernest Hemmingway) بھی ہاتھ کے کڑے پر یقین رکھتا تھا۔ اعتبار کرنا انسان کی عادت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ اعتبار انسان کی ابتدائی تنہائی کا نتیجہ ہے۔ چھ ارب انسانوں میں بھی فرد تنہا ہو سکتا ہے اور جب کوئی نہ تھا تو انسان کا اعتبار کتنا ترس رہا ہوگا۔ ذہنِ انسان کی ابتدائی تقسیم یقین اور بے یقینی کی تھی۔ بے یقینی ایک خود غرض جبلت کا فطری انجام ہے۔ اخلاص، محبت اور ایثار کم سے کم جبلی دور کی پیداوار نہیں ہو سکتے۔ عقل، دور اندیشی، تعمیر مستقبل سریع العمل جبلت میں وجود پذیر نہیں ہو سکتے۔ بہت سے لوگ جو کسی الٰہیاتی وجود پر یقین رکھتے ہیں، کسی حقیقی دلیل کے لیے سسکتے نظر آتے ہیں۔ ان کے دلائل جبلی آسیب کے سائے لگتے ہیں۔ کیا آسیب جز و ذہن اور مذہب سے بڑی سچائی نہیں ہے؟

کیا طویل عرصہ تک عرصہ دہر میں رہنے والا انسان متفقہ طور پر عقلی سیادت کو تسلیم

کر چکا ہے۔ کیا مذہب انسانوں میں اجتماعی اور اخلاقی شعور پیدا کرنے کے قابل ہوا اور کیا نسلِ انسان نے مذہب کی شکل میں ایک مفروضہ جنت کے تصور کو متشکل کر لیا ہے؟

ہر جگہ مذہب کی وحدانیت تقسیم شدہ نظر آتی ہے۔ مکمل انضباط اور صورت امن کی بجائے مذہب ایک تقسیم کار طاقت نظر آتا ہے، جو عام جبلّی تعصّبات سے بالاتر زیادہ مؤثر اور ہلاکت خیز صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

کیا مذہب ہی مقصود انسان ہے؟ اور اگر مذہب کی کوئی وحدانی قوتِ تخلیق موجود ہو تو اس کا مقصد یہی تقسیم و تعصب ہوگا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم مذہب کی بجائے کسی جبلت کے پردہ پوش فنٹم (Phantom) کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ تو نہیں کہ مرغوب اور مؤثر فریب نے ہمیں عقل کی کسی ایسی پگڈنڈی پر ڈال دیا جو Diversion کا شکار ہے اور کبھی بھی شاہراہِ یقین تک نہیں پہنچ سکتی۔

مذہب اب ایک ایسی ترغیب نظر آتا ہے جو کارل مارکس کو Have-nots کے ہلاکت زدہ چہروں کی وحشت کا ہم رنگ ہے۔ مذہب ایسے ردِّعمل کی طرح ہے جو ہیروئن (Heroin) کی Addiction کی طرح سوچ سمجھ کے تمام پہلوؤں کو نظر انداز کرتا ہوا وہ تمام خصائص اُجاگر کر رہا ہے، جو انسان کے ابتدائی دورِ بقا میں موجود تھے۔ کم از کم یہ مذہب کسی علیم و حکیم ربِ کائنات کی لوحِ محفوظ میں درج نہیں ہو سکتا۔ مذہب میرے جنون کی ایک سمت ہے۔ میری محرومیوں کا ردِّعمل ہے اور میرے ہی اندازِ فکر کے مطابق میرا ہی پیش کردہ

حل ہے۔ اس میں کسی خارجی اعلیٰ ترین تخلیقی وجود کا کوئی پیرایۂ اخلاق نظر نہیں آتا۔ مذہب کا انکار کرنے والی تمام قوتیں اسی مذہب کے وجود سے انکار کرتی ہیں اور دنیا کو اپنے بنائے ہوئے ضابطۂ اخلاق سے سنوارنے کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ متغیر اور متبادل حل جو مفکرینِ لادینیت پیش کر سکے ہیں، نہ تو متفقہ ہے اور نہ ہی پائدار۔ یہ انسان کی اعصابی تھکن کا نتیجہ ہے کہ وہ کم بدتر کا انتخاب کر رہا ہے۔ یہ نظام بظاہر انسان کی حمایت کرتا نظر آتا ہے، مگر اس کی عملی صورت کا تفاوت اتنا بڑھ گیا کہ اگر یہ نظام اپنی فطری عمر پوری کر سکا تو موجودہ انسانی تمدن کو موہنجوداڑو، ہڑپہ، پومپائی (Pompeii) اور عاد و ثمود کے کھنڈرات میں بدل دے گا۔ شترمرغ ریت میں سر چھپا کے وحشت اور ہلاکت کے مارے ہوئے خون آشام بھیڑیوں کی چیرہ دستیوں سے نہیں بچ سکتا۔

یہ کہنا اب بھی مشکل ہے کہ ہم ترقی یافتہ ہیں، مہذب ہیں اور ہمارا مستقبل روشن ہے۔ ہجوم انسانوں سے خالی نظر آتے ہیں۔ اعلیٰ ترین درسگاہیں عقل و معرفت کی نوحہ گر ہیں۔ دانشورِ عہدِ قدیم کے وہ ساکت و صامت بُت ہیں جن کو اپنی پرستش کے سوا کچھ اور غرض نہیں۔ عقلی تصرفات اعداد و شمار اور اشیاء کے غلبے کے اسیر ہیں۔ ادائے تعلیم نے مشرق و مغرب میں تازہ بُت تخلیق کر لئے ہیں۔ درسگاہوں کی شکل میں اور اساتذۂ تحقیق کی شکل میں۔ پیچ در پیچ علم ایسی پگڈنڈیوں پر گامزن ہے کہ راہِ عقل اب کسی اداس مسافر کے پاؤں کی چاپ سے بھی محروم ہو چکی ہے۔

مذہب اور لامذہب ایسے ہمسائے ہیں کہ جو رہتے تو اکٹھے ہیں مگر ایک دوسرے

کی املاک پر قبضہ غاصبانہ کے حریص ہیں۔ انسانی فکر کی بے راہ روی کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ کیا گناہ، ثواب، جزا اور سزا کا بحران درپیش ہے؟ کیا انسان کسی جابرانہ نظام کے تسلط کے خلاف اپنی احمقانہ جدوجہد کو جاری رکھنے کا عزم رکھے ہوئے ہیں؟ کیا ایک ناپائدار دنیا میں ناپائدار زندگی کے تصور نے اس کے حواس سلب کر لئے ہیں؟ اور کیا یہ تمام انحراف عمر مختصر کا گلہ ہے؟۔ مہیب اور بے حس کائنات میں اپنے وجود کی تحقیر اور بے بسی کا ردعمل ہے۔ دامنِ انسان وساوس سے تار تار ہے اور اُمید۔۔۔۔۔۔۔ لامحدود کائنات میں بے نام ونشان سیارچے کی طرح منتشر، بے بس، بے منزل، بے حقیقت۔۔۔۔ صنعتِ فریب ترقی پذیر ہے۔ سراب در سراب جہالت عقل ودانش کے لباس میں فروغ پذیر ہیں۔ سرابِ چشم میں بہت کچھ نظر آ رہا ہے۔ سائی سکریپرز، ایسکیلیٹرز، حیران کن کمپیوٹرز، برق رفتار فضاؤں سے گذرتے ہوئے مسافرت کے آلات، میزائل، شٹل، مریخ اور زحل کا نوآبادیاتی تصور، عمر دراز کے جینیاتی خواب، امراض پر تصرف، ہیپاٹائٹس، کینسر اور ایڈز پر غلبہ پانے والی ادویات، دست وپا کی اذیتوں کو کم کرنے والی مشینیں، کوانٹم اور اضافیت کی تحقیقات، نت نئے معاشی نظریات، تفسیرِ کائنات کی توجیہات اور تسخیر کائنات کے عزائم، بہت کچھ تو نظر آ رہا ہے۔ ترقی اور استعداد میں کیا شک ہوسکتا ہے۔

ہاں مگر یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اپنے اپنے عصر میں اپنے اپنے معیار کے مطابق پہلے بھی اقوامِ دنیا نے ترقی اور تنزل کے مدارج طے کیے ہیں۔ اگر ان اقوام نے فی الواقع ترقی اور عزت کے مناصب حاصل کیے تو وہ نیست و نابود کیوں ہوگئیں۔ تاریخ تواردِ ہے' تسلسل ہے۔ انسان کی ملائکہ پر بنیادی برتری ہی یہی تھی کہ ماضی کے اسباق کو زندہ رکھتا ہے اور اس میں غلطی اور حماقت کے اقدام دور کر کے اُسے حال میں بہتری کے لیے استعمال کرتا ہے اور مستقبل کے اشارات چھوڑ دیتا ہے۔ مگر تاریخ وہ واحد بدقسمت درس بھی ہے' جس نے کبھی بھی کسی آمر اور جاہ پرست کو ہدایت نہیں بخشی۔ ہر آمرِ مطلق نے تاریخ کو طاقِ نسیاں پر رکھا اور اپنے آپ ہی کو تاریخ ساز سمجھا۔ اس نے کسی گذرے ہوئے واقعہ سے ہدایت طلب نہیں کی۔ کتنی ہی مرتبہ خدائے واحد کی پرستش بتوں کی یلغار کی نذر ہوئی۔ کتنے ہی فاتحین انہی حماقتوں کا شکار ہوئے جو ان سے پہلوں سے سرزد ہوئیں۔ یونان کے فلسفی اور ایتھنز کے جمہوری انداز بھلا دیئے گئے۔ روما کے دیوتاؤں کو سسرو (Cicero) اور پلوٹارک بھی نہ بچا سکے۔ تاریخ انضباطِ نفس میں ناکام ہوگئی۔ تاریخ دلچسپ ہے۔ کھنڈروں

اور ازمنۂ قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ کے معاشی، معاشرتی اور مذہبی اقدار کو سمیٹے ہوئے ہے۔ تاریخ کو مکمل سچائی کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ واقعات پر رائے زنی کرنے والے بہت بعد میں آتے ہیں۔ درسِ عبرت سیکھنے والے تو کبھی بھی نہیں آتے۔ میدانِ جنگ میں لڑنا اور درس گاہوں کی آرام دہ کرسیوں پر گفتگوئے جنگ کرنا بہت بڑا فاصلہ ہے۔

فاسلز (Fossils) حیاتِ انسانی کی تاریخ مرتب کرتے ہیں اور تاریخ قوموں اور افراد کے کارنامے ماضی کے اندھیروں میں دور دراز کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی طرح روشن رکھتی ہے۔ زمین اور آسمان کے فاصلے شاید رات کو چمکتے ستاروں سے کم نظر آتے ہیں۔ بھولے ہوئے اسباق کبھی ایک لفظ اور فقرے کے یاد آنے سے زندہ ہو جاتے ہیں۔ فاصلوں کا احساس کسی سنگِ منزل سے کم ہو جاتا ہے۔ مگر تاریخ تو حقائق کی داستان نہیں رہی۔ آج کی حماقتیں ہمیں ماضی کی خطاؤں کی تماثیل نظر آتی ہیں۔ زوال سے پہلے کوئی تأسف کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ زوال ہی فلسفۂ وجود ہے۔ بہت سے دانشور ایسے ہیں جنہیں حسینؓ اور یزید دونوں مظلوم نظر آتے ہیں۔ پیغمبرانِ قدس کے کچھ ناقد ایسے بھی ہیں جنہیں انسانوں کی گلیکسی کے یہ روشن آفتاب بھی آمریت کے طلب گار نظر آتے ہیں۔

کیا یہی ان کی عقل ہے جو ترقی پذیر ہے؟ حضرت انسان ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا کہ اس نے تاریخ کا مطالعہ کیوں کرنا ہے اور کس لیے کرنا ہے۔ آثارِ قدیمہ (Antiquities) سے ڈرائنگ روم کی زینت کا کام تو لیا جاتا ہے مگر درسِ عبرت کی تحصیل فرسودگی کی علامت ہے۔ مہاتما بدھ نے اس خوف سے خدا کا نام نہ لیا کہ اس کا دیا نام بھی

برہمن کے بت کدے میں ایک پتھر کا اضافہ نہ کر جائے مگر تاریخ سے عبرت حاصل کرنے والے اشوک نے اسے ہی پتھر بنادیا اور درسگاہوں میں مہاتما بدھ کی تعلیم کی بجائے محکوم بت تراشوں کے کام کی تفصیلات یاد رکھنے کی رسم پڑ گئی۔

کیا تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ اقوامِ عالم غربت میں نہیں تباہ ہوئیں۔ یہ عجیب بات نہیں کہ ہر قوم اپنی ترقی، عظمت اور معیشت کی کثرت کے وقت انجانے حادثوں کا شکار ہوگئی۔ تاریخ نے حقائق تو پرکھے مگر کسی تاریخ نے یہ نہیں لکھا کہ ایک قوم اپنے تمرّد اور سرکشی کی وجہ سے برباد ہوئی۔ کسی نے یہ نہیں لکھا کہ عاد اولیٰ اور ثانیہ اپنے غیر انسانی اور بد اخلاقی رویوں کی وجہ سے تباہ ہوئی، مگر یہ لکھا ہوا بھی ہو تو آج کی مہذب قوموں نے اس تاریخی سبق کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ کیا انہوں نے واضح غیر اخلاقی رویوں کو قانونی تحفظ نہیں دیئے؟ کیا عقل پرستوں نے جبلتوں کی تخریب کی راہ ہموار نہیں کی؟ مستقبل کا مؤرخ یہ لکھنے کے قابل ہوجائے گا کہ حضرت انسان نے اس تاریخ سے ان فاش حماقتوں سے گریز کرتے ہوئے بہتر اور برتر انسانی معاشرے کے لیے کوشش نہیں کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نسل انسان کبھی متفق نہیں ہوئی، متحد نہیں ہوئی۔ ان میں اقدار کی ہم آہنگی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ آدم وحوا کے بیٹوں اور بیٹیوں نے عقل نہیں سیکھی۔ انہوں نے زمین بانٹی، آسمان بانٹا، جسم تقسیم کیے، خون تقسیم ہوا، اقتدار و تصرف کی جنگ لڑی، زمان و مکاں پر اپنے تصرف کے دعوے کیے اور تیزی سے اپنے انجام کو روانہ ہونے کی کوشش کی۔ اور یہ انجام تاریخ کی پہلی اقوام سے جدا نہیں ہے۔

میں اس زمانے کا ہوں مگر بغیر کسی تردد کے یہ رائے دے سکتا ہوں کہ تاریخ یہ

بتاتی ہے کہ آج کا انسان زود یا بدیر کسی طوفان نوحؑ کا' کسی قیامتِ کبریٰ کی مکمل ہلاکت کا شکار ہونے والا ہے۔ تمام تاریخ گواہ ہے کہ تمام عقلی شہادتیں اسی طرف رواں ہیں۔ یہ پیشین گوئی نہیں۔ تاریخی حقیقت ہے اور اس میں صرف زمانے کی کچھ ساعتیں حائل ہیں۔ یہ قنوطیت نہیں۔ یہ وہی حقیقت ہے' جو معجزات کے تصور سے گریز کیا کرتی ہے۔ یہ غیر حقیقی اور روحانی تصور نہیں کہ اب کی مرتبہ تاریخ اپنی تاریخ نہیں دہرائے گی۔ آپ کس معجزے کی تلاش میں ہیں اور کس سے یہ معجزہ طلب کر رہے ہیں۔ ریاضی، فزکس، جیومیٹری اور کمپیوٹر سے ہدایت پانے والے تو حقیقت پسند نہیں ہوتے۔ کتنے ہی سائنسی حقائق پرانے افسانے بن چکے ہیں اور کتنے ہی جدید سائنسی تصورات ابہام کا شکار ہیں اور کتنے ہی آخری سائنسی نتائج دوبارہ آغاز تک جا چکے ہیں۔

تاریخ بھی تو سائنس ہے' جو تسلسل سے زمان و مکاں میں اپنے نتائج کو دہراتی چلی آ رہی ہے' نہ واقعات میں انحراف ہے نہ عادات میں۔ وہی واقعات تو ہیں جو بار بار اس انجام کو بڑھتے ہیں۔ کیا آپ کو تاریخ میں یہ فارمولا نظر نہیں آتا کہ اگر باقی معاملات وہی رہیں جیسے پہلے تھے تو نتائج وہی نکلیں گے' جو پہلے تھے۔ یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ رجعت پسند کون ہے۔ اگر عقل آگے بڑھنے کا راستہ ہے تو جبلت پیچھے پلٹنے کو زندگی سمجھتی ہے' مگر کیا یہ طرزِ عمل اشیاء میں نمایاں ہوتا ہے یا تو جیجات میں۔ کار، ریل یا جہاز میں گھر سے جانے اور آنے کو تو رجعت پسندی نہیں کہتے۔ کیا قدامت کو پلٹنا رجعت ہے۔ آج کونسا ابنِ آدم ہے جو بس کی بجائے گدھے پر 100 میل کا سفر کرتا ہے۔ حقائق کی دنیا میں تو کوئی رجعت پسند نظر نہیں آیا۔ شاید آپ تعصبات کی تجدید کو رجعت پسندی کہتے ہیں۔ کوئی واپس تصورِ خدا کو جاتا ہے اور

کوئی سپارٹا (Sparta) اور لیشوس (Leshos) کی عادات کو پلٹتا ہے۔ مشرق کی رجعت کی عمر کم زمانی ہے اور اہلِ یورپ کی رجعت تو عاد و ثمود کی ہے۔

Primates تو واضح طور پر تجسس اور خیال کی طرف قدم بڑھا رہے تھے اور ہم دورِ حاضر کے لوگ Zeus دور کے Satyr اور Nymph بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ آلات ترقی کی علامات ہیں۔ وہ آلات جو اپنے وجود کو متحرک کرنے کے لیے آپ کی جنبشِ انگشت کے محتاج ہیں۔ اگر آلات ہی ترقی ہیں تو ابراہیمؑ کی بات میں کتنی سچائی ہے۔ بڑا بت ہی چھوٹوں کا قاتل ہوگا۔

انسان آزادی کے نام پر کس منزل کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے۔ کچھ ذاتی آزادیوں کے نتائج کچھ معاشروں میں نمایاں ہیں۔ کچھ ان آزادیوں سے اجتناب کر رہے ہیں جو شاید رجعت پسند ہیں۔ سوچو کہ یہ اجتنابی رجعت پسند نہ ہوں تو آزادیوں کی اگلی منزل کیا ہوگی۔ لات و منات اور ہبل تو اب بھی موجود ہیں۔ کعبہ کے گرد ننگے طواف جہالت ہیں تو ریاستی فحاشی اور Striptease کیسے عالمانہ فضائل سمجھے جا سکتے ہیں۔

ہبل نہ سہی، Statue of Liberty سہی۔ کواکب جیسے نظر آتے ہیں ویسے ہی لگتے ہیں۔ بہت سے کلیشے (cliches) دورِ حاضر کے آداب میں شامل ہیں۔ یہ طنزیہ گفتگو کا حصہ ہیں۔ سنا ان سے Dogma ٹوٹ جاتا ہے۔ آپ دقیانوسی ہو، غیر متمدن ہو، رجعت پسند ہو، عصرِ جدید کے قابل نہیں ہو۔ بے سود مذہب کے پیروکار ہو۔ ذہانت کی پسماندگی کا

شکار ہو۔ اچھی طرح پالش نہیں ہوئے' تمہارا حجاب ظاہری دراصل تمہاری عقل پر پڑا ہوا ہے۔تھوڑا گریباں کھلا ہوتو ہوا اچھی لگتی ہے۔نگاہ بے باک اور زلفوں کے لہراؤ نمایاں نہ ہوں تو تمہارا وجود تمہارے لیے طنز بن جائے گا۔تمہاری Language سے تمہارا شرف ٹپکتا ہے۔کووں کو ہمیشہ ہنس کی چال چلنی چاہیے۔تمہاری زبان مرصع اور شائستہ ہے۔مگر اس زبان کا کوئی بین الاقوامی وقار نہیں۔بول چال کے لیے زبان' غیر کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور بوزنائی اشارات تمدن وترقی کی علامت ہیں۔تم اچھے انسان ہوسکتے ہومگر جدید نہیں۔عام دریاؤں کے سفید چمکتے ہوئے پانی سمندر کے کھارے بدہیئت اور ظلمات رنگ پانی میں مل جاتے ہیں۔تجدد سمندر کی طرح ہے۔لہر در لہر تاریک تہہ سمندر سے سطح سمندر تک تاریکیوں کی مسلسل جدوجہد جن کو رحم وکرم کے برستے ہوئے بادلوں کا صاف ،مقطر اور حیات افزا روشن (شفاف) پانی بھی صاف نہیں کرسکتا۔امیر خسروؒ نے کہا تھا پانی سڑا کیوں' گھوڑا اڑا کیوں۔جواب ہے موڑا نہ گیا۔ہزارہا سال کی پیغمبرانہ کوشش بھی گتی سڑتی انسانی ذہانت کا رُخ نہیں موڑ سکتی۔جدید انسان کے معیارِ انصاف کا یہ عالم ہے کہ پریمیٹ (Primate) کے کیپوچن (Capuchin) بندر کا معیار بھی بش اور بلیئر کی قدرِ انصاف سے بہتر نظر آتا ہے۔

ایک بہت بڑا سوال جو مجھے ہمیشہ درپیش رہا' وہ یہ ہے کہ میں عقل کسے کہوں' عقلمند کسے کہوں، علم کسے کہوں، عالم کسے کہوں۔

سقراط سے رَسل (Russell) تک یا شاید دورِ حاضر کے علوم وفنون کے حرف آخر تک مجھے بار بار اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ تمام لوگوں نے جعل سازی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے انسانوں کو بنیادی ترجیحاتِ ذہن سے منحرف اور گمراہ کیا ہے۔ ذہنِ انسان کے یہ کم تر درجہ کے لوگ تھے جنہوں نے مل جل کے انسان کی عمومی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھایا اور ثانوی درجہ کی ترجیحات مرتب کیں اور ایک دوسرے کو داد وتحسین دیتے رہے اور طاغوتی فکر کو انسان کی ترقی قرار دیا۔ چلئے پہلے ایک معمول کا سوال دیکھتے ہیں۔ زمانۂ غار کے کم علم اور کم عقل انسان کے پاس زندگی گذارنے کے اسباب کم اور خطرات زیادہ تھے۔ وہ ایک Genius یا نابغہ کی طرح تھا جو اس ابتدائے زندگی کے خطرات کی اولیں توجیہ (Virgin Perception) کر رہا تھا۔ اس کے پاس تو معمول کے ذرائع بھی نہیں مگر

اس کم فہم اور کم عقل انسان نے اپنی ترجیحات کو صحیح سمجھا اور انسان کو اور امانتِ زندگی کو آپ تک پہنچا دیا۔ شجرِ حیات اپنے خون سے سینچے ہوئے شعور کے حصول کے لیے بے انداز تکالیف سے گذرا۔ آئندہ نسلوں کو محفوظ ماحول پہنچانے کی کوشش کرتا رہا، زندگی کی حفاظت، ابلاغ کی نعمت، تجربات کا اجراء اور معاشرے کی ترتیب یہ اس کے بڑے تحائف ہیں جو اُس نے اگلے لوگوں تک پہنچائے۔ ہزار ہا سال کے بعد ترقی یافتہ اور متمدن معاشرے کے فقہائے عقل و دانش اور محافظانِ حیات کی کارکردگی آپ کے سامنے ہے۔ عقل و دانش، توقیرِ ذات، ایجادات وجہ تحقیر و تسخیرِ انسان اور محافظت غارتگری میں بدل گئی ہے۔ آج کا ترقی یافتہ انسان اُس غیر متمدن، غیر ترقی یافتہ اور سادہ انسان پر کس فوقیت کا دعویٰ دار ہے۔ وہ پرانی جبلی اقدار کے خلاف جہاد کرتا ہوا عقل کا ذرہ ذرہ جمع کر رہا تھا اور یہ علوم و فنون، ایجاد و اختراع کے خزائن پر ناز کرتے ہوئے انہی بنیادی جبلتوں کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قصور اُس طویل فہرستِ علماء کا ہے جنہوں نے جان بوجھ کر نسلِ انسان کو دھوکا دیا۔ بنیادی ترجیح سے انحراف کرتے ہوئے انسان کو دلکش مگر بے سود اور مکروہ توجیحات میں اُلجھا دیا۔ فلسفی، دانشور، سیاست دان اور فاتحین ذاتی تفاخرات اور وجاہت طلبی کا شکار ہو گئے۔ کیا یہ اُن پیغمبرانِ قدس سے اظہارِ تنافر تھا۔ کون عقلمند تھا۔ وہ جو نسلِ انسان کو بنیادی ترجیح کی طرف بلاتے رہے یا وہ گروہِ نفاقِ عقل کہ انسانوں کو کم تر ترجیحات کے پیچ و خم کا شکار کرتے رہے۔ مذہب ہو نہ ہو، تھا کہ نہیں تھا۔ سوال تو بنیادی تھا۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو نے اُسے کیوں حل نہیں کیا۔ فشٹے اور نیٹشے نے کیوں نہیں طے کیا۔ وٹ گن سٹائن (Wittgenstein) اور رسل کی تحقیق میں کیوں نہیں آیا۔ شاید ایک ہی وجہ نظر آتی ہے کہ یہ اذہان اُس درجہ کے

نہیں تھے کہ زندگی کے فلسفہ کی ترجیحات ترتیب دے سکتے۔ یہ وہ کم درجہ عقل تھی جو حقیقت اور معاشرت کے دائرہ کار سے آگے نہیں بڑھی۔ جنہوں نے اپنی سوچوں کو تفاخر اور وجاہت کے ذرائع سمجھا۔ یہ اپنے ہی حسن عقل کے پجاری تھے۔ اُس کاسمولوجسٹ (Cosmologist) کو دیکھئے جو ابتدائے کائنات پر غور کر رہا ہے اور بنیادی انسانی سوال سے گریز کر رہا ہے۔ آئن سٹائن اضافتِ کائنات میں الجھا ہوا ہے' مگر اپنی موجودگی زمین اور تخلیق کا بنیادی اصول فراموش کر بیٹھا۔ یقین جانئے' میں طویل زمانی اور مکانی خودفراموشی کا کوئی جواز نہیں مرتب کر سکا۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انسانی ذہانتوں کے یہ بڑے نام مجھے فریبِ فکر کے تارِ عنکبوت میں الجھے نظر آتے ہیں۔ ان سب نے مل کر جملہ نسلِ انسان کو دھوکا دیا' یا شاید یہ فریب خوردہ انسان اس بات پر مُصر تھے کہ ہم نسلِ انسان کی فکری استعداد کو محدود کر کے ذمہ دارانہ عقل و احساس تک نہ پہنچنے دیں' جو اِن کی محدود اور منافقانہ عقل کے پول کھول دے' یہ وہ کم فہم اور کم عقل لوگوں کی قطار ہے جو بنیادی خطائے انسان کو شرف عقل و معرفت بنا کر اپنے ہم جنس انسانوں کو یہاں تک لے آئی ہے کہ انسان ناشناخت ہے' منزل گم کردہ اور عاقبت معدوم۔

میں زندگی میں کبھی شکی اور بدمزاج نہیں رہا۔ چند لمحے تو پھر انسان کی پسماندگی کی نذر ہو ہی جاتے ہیں' نہ یہ کہ میں کسی انسان کے شرف کا حاسد رہا۔ انسانی ترقی کے ایک ایک قدم سے میرے اندر بھی برتری کے احساس نے جنم لیا مگر یہ سوال جس کا میں ابتدائے حیات میں شکار ہوا' میرا نہیں تھا۔ یہ تو وہ سوال ہے جس کے بغیر کوئی بھی زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ اُس پرچہ سوال کا کیا حل ہوگا جس کے سارے جواب ہی غیر متعلقہ ہوں۔

عمرِ مختصر کی ابتداء اور انتہا اور جو کچھ اس کے درمیان واقع ہوتا ہے، بڑی آسانی سے کچھ اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی زندگی کسی نرالے، انوکھے اور غیر معمولی انداز حیات میں نہیں گذرتی۔ جو لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف اور جدا سمجھتے ہیں، وہ بھی ایک قسم میں سما جاتے ہیں۔ شہوات بدن بھی ایک جیسی ہیں اور شہوات خیال بھی۔ غور سے دیکھا جائے تو منفی اور مثبت ردعمل بھی ایک جیسا ہے۔

کیا مناسب ہے کہ ہندوانہ تقسیم رائج کی جائے۔ برہمن، پجاری آشرم، گرستھ آشرم، گربھ آشرم اور پھر تلاش حقائق کا آخری آشرم یعنی رشی منی آشرم۔ کیا یہی حال تمام دنیا کا نہیں کہ بنیادی اور اہم ترین حقیقت کے لیے ہم اس عمر کا انتخاب کریں جس تک پہنچنا بھی غیر یقینی ہے۔ کیا کوئی ایسا شخص دانائی کا دعوے دار ہو سکتا ہے جو تمام عمر کی ترجیح اول کو عمر آخر کے اس حصے میں حل کرنے کی کوشش کرے جب حواس خمسہ زوال پذیر اور عقل ارذل ہو چکی ہو۔

کیا نسل انسان کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں کہ وہ کس حیثیت سے زندگی گذارنے آیا ہے۔ ایک بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ موجودہ انسانی فکر خودستائشی کا شکار ہے۔ شاید اپنے آپ کو اس بے کراں وسعت میں ہم اکیلا پا رہے ہیں، جس کی سر دست ہم کو کوئی مضبوط شہادت نصیب نہیں ہے۔ خود پسندی کا عالم یہ ہے کہ ہم چو ما دیگرے نیست۔

ابھی ہم کائناتی معلومات کی دہلیز پر ہیں اور گمان یہ ہے کہ ہم وارثِ کائنات ہیں۔ ابھی ہم زمین و آسمان کی مخلوقات کے علم سے بھی بے بہرہ ہیں۔ لادینیت کے بے بصر عالم بغیر شہادتِ حقائق کے غیر طبعی اور غیر حقیقی اور ماورائی زندگی کے قائل نہیں مگر انکار صرف اس بات پر قائم ہے کہ شہادتِ نظری اور شہادتِ بصری موجود نہیں۔ کیا ذہن کے تمام خدشات، وساوس اور تخیلات نظری اور بصری شہادت ہی پر قائم ہوتے ہیں۔ ایسے ہوتا تو شاید ادیب کبھی ایک نیا جملہ نہ لکھ پاتے اور شاعر کلام میں کوئی اُپج نہ تخلیق کر پاتا۔ سائنس دان جو صرف اشیاء کے تعلق کا طالب علم ہے، اشیاء کی حقیقت سے بے بہرہ ہے۔ چند اعداد و شمار کو شائی لاک کی طرح سمیٹے ہوئے تمام ماورائے اعداد علوم کو مفروضہ سمجھ کر فارغ کر دیتا ہے۔ وہ اتنا مجبور ہے کہ بہترین انسانی اوصاف، تخلیقی رویے اور خیالات کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں غیر حقیقی قرار دیتا ہے۔ اس کا انکار اس کی عقلی تنافر بن چکا ہے اور عظمت کے شزوفرینیا (Schizophrenia) کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے معمولاتِ زندگی پر آخری سند سمجھا جائے۔

مگر بہت سارے سائنسدان ایسے ہیں کہ جن کی ذہانتوں کے بنیادی معیار متناسب سے کم تر ہیں۔ بہت سارے زندگی کے مسائل میں اُن کی اپروچ غیر حقیقی، غیر عملی اور بعض اوقات احمقانہ ہے۔ کسی سائنسدان نے بھی آج تک حیات انسانی کے اس بنیادی سوال کا جواب نہیں دیا کہ زندگی ہماری ہے یا کسی کی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا' کیا یہ سوال انتہاء کی اہمیت کا حامل نہیں کہ ہم آزاد ہیں یا غلام۔

دخول اور اخراج کے دو انجام ہمارے ہیں یا ان پر کسی اور کا اختیار چلتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ہم آزاد ہیں تو کیا کسی انسان کو' چاہے وہ پیغمبر ہو، فلسفی یا سائنسدان' کسی دوسرے انسان کے اخلاقی اور جسمانی رویے Dictate کرنے کا حق حاصل ہے؟ کیا خودغرضی اور خودپرستی ہی وہ بنیادی جبلت نہ ہوگی جس پر کارخانہ حیات کی بنیاد ہوگی۔

کیا ہم پوری زندگی یہ اہم ترین سوال حل کیے بغیر گذاریں گے کہ ہم آزاد ہیں کہ غلام۔ کیا دانشورانِ قدیم و حاضر کا یہ بنیادی اخلاقی اور عقلی منصب نہیں کہ وہ اس ابتدائی سوال کا زندگی کے آغاز ہی میں جواب طلب کرتے تاکہ باقی ماندہ زندگی کی ذمہ داریوں کا تعین ہو سکے۔ کیا ہماری آزادی اور غلامی میں تصور خدا حائل نہیں ہے۔ کیا تمام غور وفکر کرنے والوں کا یہ حق نہیں کہ وہ انسانی فکر کے اس مسئلے کا حل بتائیں۔ کیونکہ اگر خدا ہے تو ہم آزاد نہیں ہیں۔ ہم نہ چاہیں گے کہ اپنی آزادی کے سب سے بڑے حریف کو جاننے کی کوشش کریں۔ وہ خدا جو زمین و آسماں بنانے کا دعویدار ہے۔ وہ جو ابد لآباد تک زمین کے نظام، اُس کے ذرائع کو' اُس کی آبادی کو، اس کے زوال اور عروج کو' اس کے جنگ وجدل

کے نتائج کو، موسموں کے تغیر و تبدل کو، نسل و نسب کو، اولاد کو، پیشے اور کاروبار کی کمی بیشی کو، صحت اور بیماری کو، تکلیف اور تبسم کو، تباہ کن بادِ سموم اور نرم رو نسیم سحر کو، گل و لالہ پر چمکتے ہوئے شبنمی قطروں اور خزاں کے موسموں میں بے رنگ بے آب زرد پتوں کو، برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں کو، برستے ہوئے بادلوں کو، گہرے سمندروں کو، ساکت و صامت پہاڑوں کو، موت و حیات کے بے رحم تسلسل کو اپنی حاکمیت کے مظاہر قرار دیتا ہے۔ اس خدا کے ہوتے ہوئے ہم کیسے آزاد ہو سکتے ہیں۔ جس کے خلاف نہ طاقت، نہ احتجاج، نہ کوشش، نہ آرزو، نہ علم و عقل، نہ سائنس کوئی بھی انسانی وصف اس کی حکومت میں مداخلت کر سکتا ہے نہ معاونت۔

کس دانا فلسفی نے اور کس بزعمِ خود ذہین سائنسدان نے اس بنیادی سوال کو حل کرنے کی کوشش کی؟ کون تھا جس نے خدا کی تلاش میں زندگی صرف کی اور پھر اپنی تحقیق کے نتائج کے طور پر کہا کہ لو کوتم آزاد ہو، خدا کوئی نہیں ہے۔

مذہب کے معاملے میں شاید سائنسدان سے بڑھ کر کوئی کم ظرف نہیں۔ وہ ایک بنیادی تضاد کا شکار ہے۔ ذرا ایمان کی کہیے کہ ایک سائنسدان ایک دریافت یا جزو دریافت کے لیے زندگی گذار دیتا ہے۔ وہ ایک Equation کے حصول کے لیے 20 تا 50 سال غرق کر دیتا ہے۔ فلیمنگ ایک کلچر پلیٹ پر آٹھ سال مصروف رہا۔ نیوٹن برس ہا برس کی ریاضتِ ذہن کی بنا پر ایک اصول دریافت کرنے کے قابل ہوا۔ کسی نے افلاک کے تجسس میں اور کسی نے ایک وائرس کی تلاش حقیقت میں زندگی صرف کی۔ مگر کارل سیگاں اور رسل جیسے

دانشور جب مذہب کی جانب آتے ہیں تو عجیب احمقانہ، فوری اور مشتعل رائے سے نوازنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی سائنسی دیانت مصدقہ اور ان کی مذہبی بد دیانتی اظہر من الشمس ہے۔ یہ ان سے پوچھئے کہ ایک معمولی سے مظہر فطرت کے مطالعہ کے لیے اگر آپ کو پوری عمر کے تحصیل علم کی ضرورت ہے تو کیا کائنات کے علیم وحکیم رب کے مطالعہ کے لیے کھلنڈرے اور کم عقل بچوں کی اپروچ چاہیے۔

اور دوسری بات اس سے بھی حیرت ناک ہے۔ جن حقائق کے مطالعہ میں یہ کسی جذباتی، غیر مرئی اور غیر معروضی عقل کے سخت مخالف ہوتے ہیں اور جن کے لیے حقائق کی تلاش میں جذباتی رویہ بدترین طعنہ ہیں، وہ مذہب پر جس عاجلانہ اور احمقانہ طرز فکر کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ ناقابلِ یقین ہے۔

بہت سے کم تر ذہنیت کے سائنس کے اساتذہ صرف شخصی آزادی اور ذاتی طرز فکر کے دفاع کے لیے مذہب کی مخالفت کرتے ہیں۔ ایک اور بڑا خدشہ انہیں یہ لاحق ہوتا ہے کہ جو بنیادی، نسلی اور جبلی مذہبی آسیب ان کے سروں پر مسلط ہوتا ہے، وہ کہیں تحقیق مذہب سے تحلیل نہ ہوجائے۔ یہ جان بوجھ کر مذہب کو عقل وفہم سے عاری ایک ایسے Taboo کی طرح سلامت رکھنا چاہتے ہیں، جو بوقت ضرورت انہیں کسی مزار پر، کسی بزرگ کے آستانہ پر یا کسی جعلی مذہبی معالج کے پاس جانے کی رخصت دے۔

بھلا ان سے پوچھو کہ آپ اس خدا کی کیا پرستش کروگے جو آپ کی معروضی تحقیق

کے چند سوالوں سے بوکھلا کر اپنی کائنات چھوڑ کے بھاگ جائے۔ کیا خدا ازمنۂ قدیم سے آگے نہیں بڑھا۔ صورتِ حیات جو تیرِ ترکشِ خداوند سے نکلا' وہ یقین کے مفروضہ طلسم کو توڑتا ہوا تشکیک کے صحرا میں کھو گیا۔ مگر شیطان بھی کیا بودا ہے۔ عجب خدا ہے جو ابھی ابتدائی Sciences سے بھی آگاہ نہیں اور دعویٰ اصولِ تخلیق کا مدعی ہے۔ اپنے فرسودہ وسائل کی دنیا کو جدید انسان کی تحقیق سے جدید عقلی اختراعات سے لرزاں دیکھتا ہے۔ گلیور (Gulliver) کی طرح بونوں کے دھاگوں سے جکڑا گیا ہے۔ طاقت اور عظمت کا علم اور حکمت کی معراج سائنس کے چند اصولوں سے خوف زدہ ہو کر اپنے فرضی وجود پر مطمئن ہے۔ یہی تصور ہے نا' سائنسدانوں کے اللہ کے بارے میں..... بہ ایں عقل و دانش بباید گریست۔

فلسفی اور سائنس دان جب تصورِ الٰہیات کی طرف آتے ہیں تو ان کا سب سے بڑا مسئلہ تصور اور حقیقتِ وجود کے مابین فاصلہ طے کرنا ہے۔ وہ خدا کے تصور کے قائل ہیں مگر خدا کے حقیقی وجود سے مطلق گریزاں۔ کیا زمانے میں خدا کا کوئی Specialist نہیں گذرا، کیا کسی نے بھی زندگی اللہ کو نہیں دی۔ کیا جستجوئے حقیقت کسی انسان کے بس کا روگ نہیں تھی۔ کیا سرزمینِ عقل پر یقین کا کوئی ایسا پھول نہیں کھلا جس کی بنیاد تحقیق و جستجو پر تھی۔ کیا خدائی عقل و دانش سے ہمیشہ محروم رہی۔ کیا اللہ پر یقین والے ہمیشہ بے بصر جذبات پر بھروسہ کرتے رہے۔ کیا مذہب کا وقت متعین تھا اور کیا آفتابِ عقل کے طلوع میں مذہب کور چشم چمگادڑ کی طرح الٹا لٹک کر اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔

یہ خوف کہ ہماری جدید معلومات کی روشنی میں ربِ کائنات کا علم کہیں دقیانوسی نہ

نکل آئے' کتنا مہمل اور احمقانہ ہے۔ بہت سے سائنسی فکر کے لوگ اس بات پر معترض ہیں کہ اللہ کی کتاب سے سائنسی توجیہات نہیں تلاش کرنی چاہیے۔ اور فرض کرو اگر اللہ کو شوق ہو کچھ سائنسی حقائق بیان کرنے کا تو آپ کیا کریں گے۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ الہامی کتاب سائنس کی کتاب نہیں مگر کتابِ تخلیق ضرور ہے۔ یہ امر محال ہے کہ اس میں آفرینش کائنات پر، حیات پر، انجام کائنات پر، اسباب اور وسائل کائنات پر اللہ کے احکام درج نہ ہوں۔ آپ کا کام تحقیق وتنقید ہے تو شوق پورا کیجئے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ انسان ہزار ہا غلطیوں کے باوجود اپنے انسانی Status سے محروم نہیں ہوتا اور خدا ایک غلطی بھی کرے تو خدا نہیں رہتا تو آپ انسانوں کی اس مصیبت میں ان کی مدد کیوں نہیں فرماتے۔

کیوں نہیں آپ جرأت اور ہمت فرما کر قرآن کا بخوبی مطالعہ کر کے تحقیق اور جستجو کے اسی انداز سے جس سے آپ سائنسی حقائق کا مطالعہ کرتے ہیں' اعلان فرماتے کہ خدا کو تو بنیادی سائنسی حقائق ہی کا علم نہیں ہے۔ یہ کہ وہ مراتب فکر کائنات کم جانتا ہے۔ یا کہ وہ قافلہ صحرا کا وہ داستان گو ہے جو عموماً مسافروں کی تھکن دور کرنے کے لیے ماورائی داستانوں کا سہارا لیتا ہے۔ ہاں میں نے لفظ قرآن لکھا ہے۔ اس کی وجہ خاص ہے کہ ایک تو یہ محفوظ ترین کتابِ مذہب ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے سوا اللہ کسی اور کتاب کی ضمانت نہیں دیتا۔ اس کے ہر جملے اور فقرے کی اور اس میں درج تمام حقائق کی شخصی ضمانت دیتا ہے۔

ایک غلطی کی نشاندہی اور اللہ سے نجات، کتنا آسان ہے صدیوں کے آسیب کا

علاج۔ مگر ہر فلسفی اور دانشور کو اس تنقید کے لیے اہلیت کا ثبوت دینا پڑے گا۔ آرام کرسی پر تفریحِ احساس کے ساتھ یہ تنقید نہیں ہوسکتی۔ معاملہ بہت اہم ہے۔ جستجو اور تحقیق طویل اور الم انگیز۔ آیئے جائزہ لیجئے اس طرزِ عمل کا جو ماہر عمرانیات خدا کے بارے میں رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ خدا ضرورتِ انسان ہے۔ اس نے یہ تصور اپنے خوف و وحشت کے بحران میں واحد طرزِ نجات کے طور پر گڑھا ہے۔ یہ کہ ہر معاشرے کا خدا اپنا ہے۔ یہ تفاوت بذات خود اس بات کا مظہر ہے کہ خدا مفروضہ ہے۔

مگر غور فرمایئے کہ عالم عمرانیات اللہ پر نہیں تحقیق فرما رہا۔ اس کو کوئی شوق نہیں کہ وہ اللہ کو جانے، سمجھے اور اس کے بارے میں رائے دے۔ یہ رائے تو وہ اس تصور کے بارے میں دے رہا ہے جو معاشرے میں دوسرے معاملات کے ساتھ موجود ہے۔ کوئی معاشرہ جانور کا شکار کیسے کرتا ہے اور گھر کیسے بساتا ہے اور غیر مرئی وجود کے آسیب کو کیسے سلامت رکھتا ہے۔ عمرانیات کے فلسفی کو دلچسپی خدا سے نہیں بلکہ اُس تصورِ خدا سے ہے جو کسی Social Unit میں کسی تہذیبی دور میں خود رو پودے کی طرح اگ آتا ہے۔ البتہ عمرانیات کے مطالعہ میں مجھے ایک بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ جس ابتدائی انسان کو منہ دھونا نہیں آتا تھا، دانت صاف کرنے نہیں آتے تھے، گوشت پکانا نہیں آتا تھا، گھر بسانا نہیں آتا تھا، جس کے پاس صحن اور ڈرائینگ روم کا کوئی تصور نہیں تھا، سبزیاں اگانے کا فعل مفقود تھا۔ کھیتی باڑی دور کی بات تھی، بیج نا پید اور فصل نا پید، جو Habilis اور Erectus کی صورت جس کی خاطر شب و روز جنگلی درندوں کی طرح مچان پر بیٹھا تھا۔ جو عورت کی ضرورت کے سوا کسی اور جذبے سے آشنا نہ تھا۔ کیا عجیب بات ہے کہ اس نے پہلا کام خدا کے بارے میں جاننے

کا کیا۔ پہلا تمدن ہی مذہبی تھا۔ تمام ابتدائی انسانی معاشرہ Priest مذہبی معاشرہ تھا۔ وہ رسوماتِ مذہب ادا کر رہا ہے۔ مردے دفنائے جا رہے ہیں۔ دعائیں پڑھی جا رہی ہیں۔ چین اور عراق کی اموات پر پھول چڑھانے کی رسومات بھی موجود ہیں۔

کیا یہ تو نہیں کہ اس مجبور اور معذور عقل انسان کو کوئی Alien معلم مہیا تھا۔ یہ تو نہیں کہ عقل کے ذرہ برابر فشار کے ساتھ ہی اس نے سب سے پہلے کسی ربِ عظیم کا مظاہرہ دیکھ لیا۔ کیا یہ تو نہیں کہ اس کے وسائل میں کوئی بہتر اور برتر وسیلہ کسی خارجی طاقت کے ذریعے اسے قدم قدم آگے بڑھا رہا ہو۔ جب ماں ابھی اپنی فطرت سے ناآشنا تھی' کوئی اُسے بچے کی ناف کاٹنے کا سبق دے رہا ہو' کوئی درند و پرند سے بچنے کے لیے اینٹ پر اینٹ رکھنا سمجھا رہا ہو کوئی انہیں بہتر ابلاغ کے لیے اشارہ اور کنایہ سے لفظ اور معنی کی طرف بڑھا رہا ہو۔

چلئے اس بات کو ثابت کرنا مشکل ہے۔ فلسفی اور سائنسدان بر امان جائیں گے۔ اتنے پرانے خدائی تصور کے خیال سے ان کے اذہان چیخ جاتے ہیں۔ وہ پہلے ہی بیچارے بہت تنگ ہیں۔ اتنے برسوں کی محنتِ شاقہ کے باوجود جو حقائق قرآن سمجھ بیٹھے تھے' ایک صدی کی مسافت بھی طے نہیں کر پائے۔ کبھی کشش رفتار سے معطل ہو جاتی ہے۔ کبھی عمومی اضافت خصوصی اضافت سے معطل ہو جاتی ہیں۔ کبھی روشنی سے تیز تر رفتار شعاع ان کے سابقہ نتائج منفعل کر دیتی ہے۔ کبھی بے یقینی (Uncertainty) ان کا منہ چڑھاتی ہے۔ کبھی ایک کائنات متعدد کائناتوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ کبھی کوانٹم بے بسی کا شکار نظر آتی

ہے۔کبھی حیات کی جہات (Dimentions) کی تحدید ناقص، کائنات کا بکھراؤ مستند مگر سکڑاو مخدوش، ازل مخصوص اور مقرر مگر ابدلا انتہا اور مسلسل۔ٹوسٹر، اوون، کار، ریل اور جہاز کے یا پھر بارودی سرنگوں، کلسٹر، سمارٹ اور نیوکس کے سوا سائنس تفہیم کائنات میں مسلسل ابہام کا شکار ہے۔اور جو اصولِ تحقیق وجستجو سائنس وضع کرتی ہے' وہ اتنی دیر بھی قائم نہیں رہتے جتنی دیر صحنِ چمن میں نسیمِ سحر کی عشوہ طرازیوں سے گلِ نوروز کی آبرو ـــــ وقت کا تعین تو اضافی ہے۔آپ خیال کرتے ہیں کہ میں اس نوجوان کی طرح ہوں جو ثقہ بزرگوں کے علم اور تجربے کا مذاق اڑا رہا ہوں۔نہیں' بلکہ میں اس پسماندہ راہرو کی طرح ہوں جو صحرا میں تمام نشان ہائے منازل کے قریب جا کر انہیں سراب و واہمہ دیکھتا ہے اور اپنے علمی اور عقلی راہبروں پر غم وغصہ سے مہذبانہ دشنام طراز ہے۔

زندگی ترجیحات کی ترتیب کا تعین ہے۔ کیا ذہنِ انسان نے یہ نعمت اپنی ذات سے حاصل کی۔ مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ یہ صلاحیت ذہن کی قائم بالذات ہے۔ درجاتِ فہم وفراست کیسے بھی ہوں، غیر محسوس طریقے سے ہر انسان اپنی ترجیحات کا تعین کرتا ہے۔ معمول کے واقعات وحالات ہیں۔ یہ ترتیب نہیں ٹوٹتی مگر جب کوئی غیر معمولی حادثہ یا واقعہ وقوع پذیر ہو تو یہ ترتیب معطل ہو جاتی ہے اور فوری اور اہم تر ترجیح اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ ذہنِ انسان کی دوسری اہم خاصیت ترجیحات کی زمانی تشکیل ہے، ترتیب ہے۔ تعلیم وہنر رزق اور استحکام فوری اور ضروری ترجیحات سمجھی جاتی ہیں۔ ذہن انہی ترجیحات کو اہم تر قرار دے کر عمر تمام کرتا ہے اور اہم ترین ترجیح کو عمر کے اس حصے میں حل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو ناقص اور ارذل ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے، تمام تر ذہنی صلاحیتیں چند بنیادی مقاصد کے حصول کے لیے ہیں، باوجود تمام مذہبی تنبیہات کے وہ پوری زندگی کی واحد ترجیح اول غیر متناسب زمان ومکاں میں حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ناقص طرزِ عمل میں اس کی جبلی خواہشات اور ذہنی تکبرات معاون ہوتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل باوجود ہر چیز کے حصول کے

انسان کے اضطراب اور اضمحلال میں مسلسل اضافہ کرتا ہے اور اطمینانِ قلب موقوف کر دیتا ہے۔ بہت سے لوگ ایک مکمل مایوسی کے بحران کا شکار ہو جاتے ہیں اور آخری لمحات میں واپسی سے مایوس ہو کر مسلسل تاریکیوں کے مسافر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

شاید یہ وہی مقام ہے، جہاں نہ چاہتے ہوئے ذہانتوں کے مدعی انکارِ خدا بھی کرتے ہیں اور انکارِ حقائق بھی۔

آزادی اور بندگی کے اس اہم ترین سوال میں اقرارِ خدا لازم نہیں ہوتا مگر شاید یہ جاننا کہ خدا ہے کہ نہیں، بہت ضروری ہوتا ہے۔ خدا کو نہ جاننے کا رسک اتنا بڑا ہے کہ اربوں سال کا مستقبل نہ صرف مخدوش ہو جاتا ہے، بلکہ عذاب ناک بھی۔ علمائے فکر کے تعصبات زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کے تکبرات خفی اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ وہ سائنسدان ہوں یا فلسفی، سیاست دان ہوں یا ادیب، ذاتی وجوہ کی شناخت اور توقیر کی وجہ سے اس سوال سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ خود بھٹکتے ہیں اور جملہ انسانوں کے بھٹکاؤ کا سبب بنتے ہیں۔ بقا اور شہرت کے ایوانوں میں خوفِ آخرت، احتساب غیر حقیقی اور افسانوی لگتا ہے۔ دوسری جانب دیکھیں تو خدائے عظیم یہ جانتے ہوئے کہ انسان نے بہترین وقت اور عقل ادنیٰ درجہ کی ترجیحات میں صرف کر دی ہے اور بنیادی اہم ترین ترجیح سے احتراز کیا ہے، ان کو ایک مسلسل اضطراب اور غفلت میں ڈال دیتا ہے۔ اور یہ حالت سکرات کی بے ہوشی تک محیط ہوتی ہے۔ انکار سے بدتر وہ تساہل ہے کہ جس کی وجہ سے فریضۂ اول سے غفلت انسان کا مستقل رویہ بن چکا ہے۔

چاہتا تو میں بھی ہوں کہ میں علم و ادب کی شخصیات کا رومانوی تصوّر بحال رکھوں مگر جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک دانستہ کوشش سے نسلِ انسان کی اہم ترین ترجیح کو مسخ کیا گیا ہے اور کم اہم ترجیحات کو اہم تر بنا کر پیش کیا گیا ہے اور بقائے حیات کو نجات سے آشنا کرنے کے بجائے غفلت و بدگمانی کا شکار کر دیا ہے، تو یقین جانئے کہ اس گروہِ دانشوراں پر ہلاکتِ انسان کا الزام لگتا ہے۔ شاید یہ وہ مسخ ہے جس کا ذکر قرآن حکیم بار بار کرتا ہے۔

عجیب بات یہ کہ انکارِ خدا کسی ذہنی تحقیق اور مسلسل فکری جدوجہد پر مبنی نہیں۔ بہت سارا انکار صرف ذاتی محرومیوں کا ردِعمل ہے۔ اکثر انکار اس مفروضہ ناانصافی (Injustice) پر قائم ہے جو انسانوں کے اسباب کی تفریق میں ہے۔ مال و اسباب اور عزت و حکومت کا تفاوت، احساسِ کمتری، توہینِ ذات، حسد و کینہ، غیض و غضب کا باعث بنتا ہے، جو کبھی مارکس اور لینن کے منفی ردِعمل کا اظہار اور کبھی فلسفہ وجودیت کے انکارِ روح و خیال کا سبب بن جاتا ہے۔ انسان دنیا کو اپنی محدود معلومات اور علاقائی تصوّرِ انصاف سے چلانا چاہتا ہے۔ وہ شاید بھول جاتا ہے کہ اللہ ایک انسان یا ایک قوم کا خدا نہیں بلکہ جملہ نسلِ انسانی کا ہے۔ مذاہب کی تقسیم غیر فطری ہے۔ اگر مذہب سے مراد تلاشِ خدا ہوتی تو تمام مذہب پرست خدا پرست ہوتے اور ان کے معیارِ عدل و انصاف میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ خدا کے احکام کی ناقص تعمیل مذہبی منافرت میں ڈھل گئی اور جس سبب نے جملہ انسانوں کو متفق اور متحد رکھنا تھا، کم عقلوں کی توجیہات کی وجہ ہے۔

برصغیر میں تاریخ تصوف کا تذکرہ شاید اسی لیے ضروری ہے کہ یہ لوگ جن سے اللہ کی پہچان ہوتی ہے' ان کے افعال و کردار خدا کے نشان ہوتے ہیں اور شاید دیوجانس کلبی (Diogenes) اور زینو (Zeno) ' ڈاینوبیسیس' پلاٹی نائی نس' آگسٹین' اکویناس اور پھر ایک طویل فہرست مسلمان صوفیا کی جنھوں نے تزکیہ ذات اور بہترین ترجیحات کے تجزیے کے ساتھ اپنے اندر بھی خدا کا اخلاص' محبت اور شعور پیدا کیا اور دوسروں کے لیے بھی ایسے واضح نشان چھوڑ دیے جس سے عامتہ الناس میں بھی رجعت فکر خدا قائم رہی۔

اسلام میں صوفیا اس لیے بھی کثرت اور تواتر سے آئے ہیں کہ اس مذہب میں خدا کا تصور بہت واضح اور طریقِ ہدایت بہت روشن ہے۔ خدا کا تصور بھی ابہام سے مکمل پاک ہے اور رسالت کا کردار بھی شفاف ہے۔ کسی بھی تقلید کرنے والے کو قرآن سے بہتر کتاب اور محمد رسول اللہؐ سے بہتر استاد نہیں مل سکتا۔ کتاب کی مکمل حفاظت اور احادیث رسولؐ کے وسیع اور مصدقہ ذخائر نے زندگی کی ہر راہ کا طرز عمل غیر مبہم کر دیا۔ اسلام میں تصوف جداگانہ یا انفرادی نہیں' عمومی نظریہ ہے۔ اخلاص' شعور ذات کی جدوجہد' توازن اور اعتدال کی ہر

کوشش فطرتاً اللہ کو جاتی ہے۔صرف قرآن ہی سے اللہ کا کائناتی تصور پیدا ہوتا ہے۔باقی مذاہب میں انسانوں کے ذاتی خیالات اور تعصبات کی وجہ سے خدا قومیا لیا گیا۔ہر قوم اور گروہ نے اللہ کو ذاتی میراث سمجھ کر اپنے خاندان اور قبیلے کے لیے مختص کر لیا اور اپنے آپ کو مقام محبوبیت عطا کر لیا۔اس کی کوئی ضمانت خدا کے کلام میں خدا کی کسی کتاب میں نہیں ملتی۔

قرآن سے معلوم ہوا کہ کائنات کی وسعتیں رب عظیم کی تخلیق کا معمولی تاثر ہیں۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے انتہا اور بے نیاز ہے۔وہ کسی کا باپ،بیٹا یا بھائی کیسے ہوسکتا ہے۔اس کا کرشمۂ جمال مکروہ بتوں کی تمثیل میں اجاگر نہیں ہوسکتا۔وہ صاحب انصاف انسانوں میں افعال وکردار کا صلہ رشتوں کی قرابت سے نہیں طے کرتا۔

اس کی ربوبیت انکار واقرار سے بالا ہے۔وہ کافر ومسلم کو ایک طرح سے رزق دیتا ہے بلکہ کافر کو مصلحت کے تحت زیادہ دیتا ہے۔یہ خدائے بزرگ وبرتر بغیر علم فہم وادراک کی حدود میں نہیں آتا۔

زیادہ علم ہی زیادہ شناخت کا باعث ہے اس لیے صوفیا نے علم خدا کو اور شناخت ذات کو واحد ترجیح قرار دیا کہ ان تمام پیروں اور ملاؤں کے ہجوم میں ایک بھی ذات شناسائی خداوند کے ابتدائی مراحل طے نہیں کرتی۔کچھ تو اس وجہ سے کہ اپنی شیطنت اور خبث باطن کو چھپانے کے لیے تسلسل سے ماورائی حکایتوں میں عوام الناس کو الجھا کر اپنے ذاتی مطالبات واغراض پورے کیے۔اور دوسرے کچھ لوگ جن میں اگر شعور واخلاص کی رمق موجود بھی ہوتو

وہ اس سلسلۂ دورغ بافی سے کبھی نکل ہی نہیں پائے اور تاریکی کا سفر جاری رہا۔ اعتبار کرنے والا اتنا سادہ اور معصوم ہے کہ وہ نہ صرف اس پورے طلسمی نظام سے مسحور ہے بلکہ وہ اس حد تک فریب خوردہ ہے کہ اپنے آپ کو تقلید محض کا اسیر کر کے جرأتِ سوال نہیں کرتا۔

شریعت اور طریقت کے دونوں راستے عطائیوں کے ہاتھ چڑھ گئے۔ علم وحقیقت خرافات کی نذر ہو گئے۔ لاحائل اور طویل وظائف کے ڈھیر لگنے شروع ہو گئے۔ چلّہ، وظائف، تسخیرات، عملیات، حاضرات کی دنیا آباد ہوگئی۔ ہر گلی اور کوچہ کا نظام تعویذات کے عاملین کے حوالے ہو گئے۔ اب کوئی ذرۂ رزق، کوئی کام، کوئی شادی بیاہ، کوئی نوکری چاکری، تعویذ کے بغیر ممکن نہیں۔ خدائی اب جادوگروں کے سپرد ہوئی اور ایسے لگتا ہے کہ ان لوگوں نے مل کر اللہ کو کائنات بدر کر دیا۔ ایسے بھی لوگ کم رہ گئے جنہوں نے خاندانی بھرم بحال رکھے ہوں۔ تصوف کے نام پر مکروہ صوفیانہ مسالک اور ملائیت کی جنگ میں برصغیر کے دونوں اطراف کے اذہان نے جھوٹ اور سچ کی تفریق ختم کر دی۔ لاحائل اور بے سروپا داستانوں کے ہجوم میں حقیقتِ الٰہیات گم ہوگئی۔ ملائیت نے یہ دیکھ کر کہ عامتہ الناس میں تصوف کے مدعیان زیادہ مقبول ومحبوب ہیں، اپنی جماعتوں میں دعویٰ تصوف کو جگہ دی مگر چونکہ مراتبِ فکرِ تصوف سے نا آشنا تھے اور حرص وآز کے کارخانۂ دراز میں صوفیانہ طاقتوں کی ایسی مائی تھالوجی (Mythology) تیار کی گئی کہ جاننے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔ مولوی طرزِ فکر نے سخت تر اصولِ بیعت قائم کیے اور فری میسنری کی طرح متحارب نظریات پر اپنے مریدین کو ایسے نظام مدرسہ کا قیدی بنا دیا کہ نہ ذہن آزاد رہا نہ اعمال۔ حیران، سراسیمہ، پریشان یہ لوگ الموت (Alamut) کے حشیشین کی ان تحریکوں میں الجھ

گئے اور تشدد، نفرت اور استحصال کی روایات باقی رہ گئیں۔ دوسری طرف نقشبندیہ، سہروردیہ، قادریہ اور چشتیہ کے نام پر مخصوص خاندانوں نے اپنے مفادات کو آگے بڑھایا اور مضبوط پیرانِ تسمہ پا کی طرح مخلوق کی گردنوں کو کس لیا۔ تصوف کے شاہین تو اللہ کے پاس پہنچ چکے تھے اور ان زاغوں کے تصرف میں بیعت، نیاز اور قوالی رہ گئی۔ ایک عمومی معلوماتی جائزہ میں یہ بات کھل جاتی ہے۔

دنیوی اختیارات کی جنگ میں استادانِ معظم کے پس ماندگان ہر اخلاق سے بالا تر ہو کر زمین، زر، مسند اور اختیار کی ہوس کے شکار ہو گئے۔ ملائیت، پاپائیت اور یہودیت کی طرح نظامِ تحفظ تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گئی اور نیک نیت مخلصین کی جگہ تربیت یافتہ جنگجوؤں نے لے لی۔ اسلام اور اللہ کی شناخت قتل و غارتگری سے ہونی شروع ہو گئی۔ سیکولر کو ایک اور بہانہ مل گیا۔ اسے اپنی تہذیبی برتری اور تمدن کی آزادی کے لیے ایک اور دلیل مل گئی اور وہ انتہائی سفاکی سے مذہب اور خاص طور پر اسلام کے ماننے والوں کے پیچھے پڑ گیا۔ یحسرۃ علی العباد۔ کہاں تو وہ مذہب حقیقت کبریٰ کو پانے کا واحد حل اور کہاں یہ مذہب جس میں صرف ذاتی تعصبات کی سڑاند۔ کہاں مذہب علم العلوم اور کہاں یہ مظاہراتِ جنوں۔ کہاں وہ شناسایانِ رموز پروردگار اور کہاں یہ تاتانِ اخلاق و کردار۔ کہاں بایزیدؒ، جنیدؒ، رابعہؒ و حسنؒ اور کہاں صرف مولوی، مولوی، مولوی، مولوی۔۔۔۔۔

اس خود ستائش گروہ نے انکسار کے تمام طریقے باطل کر دیے۔ لوگوں کے اذہان پر قابو پانے کے لیے اپنے معمولی اور چھوٹے چھوٹے اساتذہ کو اکابرین کا نام دیا اور بڑے

بڑے خطابات از خود اپنے آپ کو بخشے۔ مجھے آج تک کوئی ایسا قرینہ نہیں نظر آیا جو صوفی کو دعویٰ کرنے کی اجازت دے۔ مجدد الف ثانی کا خطاب کہاں سے آیا، کس کو ملا، کس نے دیا۔ شیخ العرب والعجم، پیرِ لاہوت، صاحبِ شش جہات، قیوم زمانہ، غوثیت، قطبیت یہ تمام مناصب برصغیر کے پیرانِ تسمہ پا اور مولویانِ تقدس مآب نے سمیٹ لیے۔ زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن۔۔۔۔ اولیائے طاغوت کے تمام انداز مذہبی اور فقیرانہ تھے۔ تلاشِ حق کا کام بہت مشکل ہوگیا۔ سوائے ایک تجسس اور مہم جُو فکر کے اور کوئی بھی یہ طلسم ہوش ربا تسخیر نہیں کر سکتا۔

علم اور عالم دونوں مفقود ہوئے۔ سیکولر، صوفی اور ملاّ کے مقاصد جدا جدا اور ذاتی تھے مگر حصول طاقت و وجاہت میں ایک ہی طرح کے سفاک۔ مذہب کے استعمال میں بے حس اور بے باک۔ بدترین جنسی برائیاں، مالی بدعنوانیاں، ذہنی خباثتیں گاہے گاہے ہر سہ فریقین کی اندرونی کہانیاں سنا دیتی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے اختیار ابھی سیکولر اور ملاّ ہی کے پاس ہے۔ ابھی شاید اسلام کا زمانہ نہیں آیا اور مہدی تو ابھی دور لگتے ہیں۔

اسلام مسلمانوں کی میراث نہیں اور نہ مسلمان علمائے مذہب کی ذاتی خواہشات ہی کا کارندہ۔ اسلام ہر فرد و بشر کا ہے۔ جس کو جہاں بھی خدا کی تلاش ہوگی اور وہ اس کے لیے کسی رستے کا انتخاب کرے گا' وہ اسلام ہی تک پہنچے گا۔ غیر اقوام میں اسلام کے خلاف تعصب مسلمانوں کی وجہ سے پیدا ہوا۔ جنگ و جدل' قتال کی ان صدیوں میں جہاں کفر و اسلام ایک دوسرے سے جنگ آزما رہے' اسلام خدائی شناخت کا مذہب ہونے کی بجائے

ذاتی اور قومی مذہب سمجھا گیا۔ اور یہ سراسر غلط فکر کا نتیجہ تھا۔ یہ وہی غلط اپروچ تھی جو یہودیت اور عیسائیت نے اپنے مذاہب کے بارے میں پیدا کی۔ دین موسیٰ اور توریت کو ذاتی ملکیت سمجھ کر یہود نے اس پر ناجائز تصرف کیا اور کتاب اللہ کی حیثیت کو قبیلوں کے تعصبات کی بیاض میں بدل دیا۔ اس طرح انجیل مقدس بھی عیسائیوں کی چیرہ دستی کا شکار ہوئی اور علمائے عیسائیت نے اس میں اپنے مطالب کے لیے تحریفات تخلیق کیں۔ اجتہادِ فکر کی تو اللہ نے ہر دور میں اجازت بخشی تھی مگر تصرف فی الآیات کی اجازت ان لوگوں نے اپنے طور پر حاصل کر لی اور جملہ انسانوں کی فلاح و بہبود کے رستے شخصی، قبائلی اور قومی ہو کے رہ گئے۔

ملا تمام مذاہب میں کم تعلیم رہا۔ لادینیت ہمیشہ وجاہت طلب رہی۔ ملائیت اور لادینیت کی جنگ اصولاً روح و بدن کی جنگ ہونی چاہیے تھی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ دونوں کا مطمح نظر حصول اختیار تھا۔ اگرچہ آج سیکولر کو غلبہ حاصل ہے، مگر مولوی سخت جان ہے اور فطری جبلی ذہانت کا مالک ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ لادینیت ذہن انسان کو سکون نہیں بہم پہنچا سکتی۔ وہ اسباب زندگی تو مہیا کر سکتی ہے مگر سکون و طمانیت نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں۔ مذہب کی دعویدار یہ جماعت اس وقت کے انتظار میں ہے جب لوگوں کی تمنائے سکون و اطمینان ضروریاتِ زندگی سے بڑھ جائے گی۔ تب وہ اپنے حصارِ حفاظت سے نکل کر پھر ایک مرتبہ اپنے اقتدار کو قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہاں پھر تاریخ کے اس عمل میں خدا اور خدا شناس ایسے عظیم بحران کو سمیٹنے کے لیے دوبارہ ترجیحات استوار کرنے کے لیے عیسیٰؑ اور مہدی پلان کر رہے ہوں گے۔

فلسفۂ ترجیحات میں سب سے بڑی رکاوٹ ترغیباتِ نفس ہیں، جو کردار سازی اور مطمحِ زندگی کی شکل میں ہماری پوری زندگی پر محیط ہوتی ہیں۔ کسی بھی کرداری صلاحیت اور پیشے کا انتخاب اوائل ہی میں ہمارے اذہان پر اس طرح مسلط ہوجاتا ہے یا کردیا جاتا ہے کہ ہم تمام عمر اس کے پیچ وخم میں گذار دیتے ہیں اور اس کو اپنے اور زندگی کے لیے لازم اور احسن قرار دیتے ہیں۔ کرشن مہاراج کی زبان میں جب کوئی خواہش ہمارے اذہان پر مسلط ہوتی ہے تو عقل کو اتنی ہی دور پھینک دیتی ہے جتنی تند وتیز ہوائیں ایک چھوٹی سی بادبانی کشتی کو سمندر کی بے کراں وسعت میں تند وتیز ہواؤں کے سپرد کردیتی ہیں۔ Career اور Character کا یہ جنون خالصتاً دنیاوی وجاہتوں کی پیداوار ہے، جو معاشرتی اور معاشی تقابلات سے ہمارے اندر جنم لیتا ہے اور ناآسودہ خواب بن کر تمام زندگی سراب حقیقت کی طرح ہمارا تعاقب کرتا ہے۔ یہ جنون نہ ہمیں قیام کرنے دیتا ہے نہ اصل حقائق ہی کو جاننے کی مہلت دیتا ہے۔ محرومیوں کے اس بحران میں آرزو نئے نئے بہروپ بدل لیتی ہے اور قبر تک خواہشات کے ابتلا میں مبتلا رکھتی ہے۔ یہ وہ خودرو بیلیں ہیں جن کی تمام تر زندگی کا انحصار ترجیحِ اول پر ہے۔ وقت اور قوت کا ضیاع اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اصلی اور حقیقی مسئلہ دور

افتادہ یا دداشت کی طرح دشتِ نسیاں میں کھو جاتا ہے۔ مدتوں بعد ایک بھولی بسری یاد کی طرح جب ہم واپس پلٹتے ہیں تو عادات اتنی راسخ اور تساہل اتنا پختہ ہو چکا ہوتا ہے کہ چاہتے ہوئے بھی ہم حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ سکرات وخمرات سے پہلے اگر یہ خیال آ بھی جائے تو ہم صرف رحمتِ بے کراں کے سہارے ہی امید رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے پاس اپنا سامانِ رہِ عافیت نہیں ہوتا۔

یوں عقل ودانش کے خود پسندانہ مشاغل بے شمار ہیں بلکہ خود پسندی ہی سب سے بڑا شغلِ عقل ہے۔ علم وعقل کے ساتھ خود پسندی کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ کم علم کی خود پسندی کا انحصار مال واسباب پر ہے اور تعلیم یافتہ خود پسند یدیت انفرادیت کی شائق ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں کوئی منفرد نہیں۔ تمام انسانوں کی کیمیائی ہیئت ایک ہے۔ افعال کے زیر وزبر سے کوئی انسان وصفِ انسانیت چھوڑ نہیں جاتا۔ جرائم سے اخلاقی اوصاف تک انسان پٹڑیاں بدلتے رہتے ہیں۔ جہالتوں سے اعلیٰ تعلیمی روایات تک ایک تسلسل ہے جس سے جملہ انسانی نسل اپنے اپنے کردار نبھاتی چلی آتی ہے۔ انوکھے تو شاید وہی لوگ ہیں جن کی مانند ہم سے کوئی بھی نہیں بن سکتا۔ ہم کوشش کے باوجود یقیناً عیسیٰؑ ومحمد (ﷺ) نہیں ہوسکتے۔ اس انتخاب کے دروازے ہم پر بند کر دیے گئے۔ زمان ومکاں کے مراحل میں یہ وہ روشن ضمیر لوگ ہیں جن کے وجود ترغیب وتحریص کی آندھیوں میں بھولی بھٹکی انسانیت کو رہِ نجات متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کو کوئی مانے نہ مانے' یہ اپنے فرائض بے صلہ ادا کرتے ہیں اور شاید ان کے بغیر انسان کے مستقبل کا بہت پہلے فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ شاید زمین ہی کو جہنم کی Annexe قرار دے دیتا۔

بڑا مسئلہ ذہنِ انسان کی خود شناسی کا ہے۔ خود رو بیل کو اگر وقت پر کاٹا نہ جائے تو مکڑی کے جالوں اور بہم دگر پیوست شاخوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ خواہشات ذہنِ انسان کو اس طرح گھیر لیتی ہیں کہ عقلِ راست کی روشنی پہنچنی مشکل ہو جاتی ہے۔ ہرج کی تعریف ایک چرواہے نے عمر فاروقؓ سے یہ کی کہ یہ وہ قابلِ خوراک جھاڑی ہے جو اتنے کانٹوں اور زہریلی شاخوں میں الجھی ہوئی ہے کہ جانور اسے اپنی خوراک بنانے سے معذور ہوتے ہیں۔ دل پر جب خواہشات کا استحصال بڑھ جائے اور ذہن ترجیحات کے چنگل میں الجھ جائے، تو عقل اور عبرت کا کوئی درس اس پر کارگر نہیں ہوتا۔ کٹاؤ (Weeding) بہت ضروری ہے۔ دانشمند وہی ہے جو احتساب کی مقراض سے خواہشات اور ترغیبات کو کاٹتا ہے اور خود پسندی کے بحران میں گرفتار نہیں ہوتا۔

چاہے کوئی چیز اور مقام کتنا ہی پسندیدہ ہو، جب ترجیحِ اول کو متاثر کرنے لگے تو اس شوریدہ سر کو کاٹ دے۔ نفسِ انسان اپنی محبت پر زندہ ہے۔ نرگسیت اس کی صفتِ اولیں ہے۔ اپنے خلاف سوچنا اس کو کسی حال میں منظور نہیں ہوتا۔ اللہ نے عقلِ نفسِ انسان کی اس صفت کے مقابل رکھ دی۔ خود انسیت ہی خود شناسی کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کے مظاہرے بے شمار اور زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہیں۔ یہ ہر انسان کے محبت اور تعلق میں نمایاں، علم و ادب کی تمام روایات میں موجود اور فلسفہ حکمت کے ہر صفحہ پر مرتسم۔ یہ خود انسیت ہم سے احساسِ خطا چھین لیتی ہے۔

اپنے آپ کو اچھا کہنے کا اُفس اور بُرا کہنے سے گریز خود انسیت کا خلاصہ ہے۔ نفس اپنے دفاع کا استحقاق ہر قیمت پر قائم رکھتا ہے اور نفسِ انسان سے بڑھ کر اللہ نے اپنا دشمن کوئی بھی نہیں بنایا۔ جبلی عادات کے پیکیج (Package) ہی کو نفس کہتے ہیں۔ عقل اگر کارساز ہے تو جبلت حیلہ ساز اور چالاک ہے۔ اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ خود انسیت کی وجہ سے عقل بھی حیلہ ساز جبلت کی آلہ کار بن جاتی ہے۔ ورنہ یہ اخلاقی بحران اتنے کیوں بڑھ جاتے کہ حکومتیں بدترین انسانی کردار کو جمہوری آزادیوں کا شرف سمجھتیں۔ مغربی دنیا کے اخلاقی افلاس کی واحد وجہ اس کی تمام تر عقلیت کا جبلی انسیت کے دام میں الجھنا ہے اور زمانہ قدیم کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی بڑا حادثہ فاجعہ ہی ان کو وہ شاک دے سکتا ہے جو جبلی خود پسندی کو غیر مستحکم کر کے ایک دفعہ پھر صراطِ عقل پر گامزن کر دے۔

مذہب کی اعلیٰ ترین قدار کو سمجھنے کے لیے خود شناسی پر اتنا اصرار کیا گیا کہ خود شناسی اور خدا شناسی ہم رنگ ہو گئیں۔ مگر کیوں۔ انسان خود تو خدا نہیں کہ وہ اپنے آپ کو جان کر کسی الٰہیاتی مفہوم تک پہنچ جائے۔ دراصل خود شناسی آج کے مطابق نفسیاتِ ذات کی

آ گہی ہے۔خدا کی تلاش ایک مکمل اعتدال کا خلاصہ ہے اور جب تک ہم اپنے ذاتی تجزیہ اور تحلیل سے نہ گذریں، ہمارے مذہبی یا سماجی نتائج مصدقہ نہیں ہوسکتے۔لالچ، فریب، احساس کمتری، احساس عظمت، طلب جاہ، وجودیت، بزگسیت اور ہزاروں باریک تر نکات ایسے ہیں جن کا فہم اپنے آپ کو سولی پر چڑھائے بغیر نہیں ہوسکتا۔کسی کی توجہ اور تعریف آپ کے ہونٹوں پر جو ایک تبسم کھلا دیتی ہے، آپ کے برسوں کی ریاضت کے نتائج کا رُخ بدل دیتا ہے۔ذہن جب کسی خوشامد کی حرص کرتا ہے تو اپنا فتویٰ قتلِ عقل لکھ رہا ہوتا ہے۔''آخری چیز جو سینۂ انسان سے نکلتی ہے حُبِ جاہ ہے۔''غزالیؒ نے کہا۔جو کوئی بھی ''ہم ایسے بنائے گئے ہیں'' (we are made so) کے فلسفہ کے قائل ہیں، وہ کبھی عرفان کی دہلیز نہیں چھو سکتے۔باوجود انتہائی معروضی (Objective) تعلیمات اور توجیہات کے اہل مغرب کے فلسفی اور دانشور اپنی اصلاح کے لیے کسی تکلیف کے عادی نہیں۔ان کا خیال ہے کہ وہ جیسے بنائے گئے، اس سے بہتر کوئی صورتِ تخلیق نہ تھی۔وہ شہرت اور وجاہت کو نقصِ فطرت نہیں، بلکہ حق منصبی سمجھتے ہیں۔مصروفیت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا یورپ اور مغربی ذہن داخلی کیفیاتِ عجز سے نا آشنا ہے۔فخر و مباہات، شہرت و عزت و وجاہت کوئی ناقابلِ نفرت اوصاف نہیں بلکہ یہ ان کے نزدیک زندگی کے فطری مقاصد ہیں اور ان کے لیے جدوجہد کرنا قطعاً غیر معقول نہیں۔ایک ذرہ برابر احساسِ زیاں نظر نہیں آتا۔شاید معروضی حیثیت کا یہ احتمال ان کے مکمل نسیان کا باعث ہے۔صدیاں گذر گئیں کہ اہل مغرب میں کوئی صوفی اور خدا شناس نہ پیدا ہوا اور صدیاں ہی گذر گئیں کہ ان کو کبھی اس کا احساس زیاں بھی پیدا نہیں ہوا۔

بہت سے لوگ معترض ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ سارتر، کامو، روسو، دوستوفسکی، شوپنہار، برگساں، کانٹ اور ہیگل بے شمار ایسے فلسفیوں اور ادیبوں کو صوفی کہنے کا شوق رکھتے ہیں۔ لوئی پاسچر اور پاسکل کچھ لوگوں کے نزدیک صوفیا ہو سکتے ہیں۔ کچھ زیادہ ذہین مستشرقے یان ین کی Journal of a Thief کو بھی تصوف کی کتاب سمجھتے ہیں۔

اچھی زبان کے انداز ہوں یا زندگی کے اچھے قرینے، انسانی ہمدردی اور مسائل کے ادراک کو صوفیانہ مشرب سمجھنا بھی مغرب کے معروضی اندازِ فکر کی اپج ہے۔ انسانیت نوازی نے بنیادی ترجیح کو بہت مجروح کیا۔ فرضِ اول کی ادائیگی کے بعد یہ فرائض تمام خدا شناسی میں چلے جاتے مگر معاملات ایسے زیروزبر ہوئے کہ انسانیت نوازی خدا سے گریز کا عذر بن گئی اور لوگوں نے اسے تصورِ خدا سے بدل لیا اور یہ دعویٰ عام ہوا کہ حقوق العباد حقوق اللہ سے فزوں تر ہیں۔ عقل جب ترجیحات کے بحران کا شکار ہو جائے تو یہی حال ہوتا ہے۔

ایک دوسرا اہم احساس کمتری مغرب سے ترسیلِ علم اور تحقیق کی وجہ سے پیدا ہوا۔ مدتوں سے مشرق کے اہلِ علم خوشہ چینِ مغرب رہے اور نہ صرف یہ کہ ان سے متاثر ہوئے بلکہ اپنے قدیم اثاثہ جاتِ علمیہ بھی نیلام کر بیٹھے۔ مشرق کے یہ معتبر جو جدید تعلیم سے آشنا ہوئے، دراصل مغربی اندازِ معاشرت کے گداگر ہی تھے۔ ان کے داخلی تجربات بھی اسی غلامانہ ذہنیت کی نذر رہو گئے اور متعدد جدید تحریکات نے جہاں کام اور تنظیم کی بناء پر مذہبی گروہوں کی بنیاد رکھی، وہاں مذہب کی اعلیٰ ترین قدر، فکر کی مخالفت اور توہین بھی ضروری سمجھی۔ طریقت اور شریعت کے مخالف قطبین اس طرزِ فکر کی وجہ سے ہیں۔ جن لوگوں نے مذہب کی بناء پر مغربی افکار کی مخالفت کی، ان کے پاس کوئی موزوں دلیل نہیں تھی۔ مدتوں

بے عقل اور بے بصر مذہبی تقلید نے ان میں زمانی Adjustment بالکل ختم کر دی تھی۔ وہ اگرچہ مخالفت کر رہے تھے۔ مگر لگتا ایسے تھا کہ جیسے فکر جدید سے خوفزدہ لرزاں و ترساں ایسے حقیر فقیر کی طرح ہیں جو خیرات نہ ملنے کی وجہ سے کسی رئیس کو کوس رہا ہو۔

ایک طرف برصغیر کے ترقی پسند دانشور، مفکر اور ادیب جن کے لیے یہ نام غلط انتساب ہیں، وہ محض بندروں کی طرح مغربی افکار کی تقلید میں بغیر تجزیہ اور تجربات کے دُزدیتہ جام چاٹ کر اپنے نفس کو تعظیم دے رہے تھے۔

بدلتے زمانوں میں اقدار سلامت نہیں رہتیں مگر اتنی بے ہنگم زمانی تبدیلی (Transition) تو کہیں بھی نہیں ہوئی جتنی برصغیر میں ہوئی۔ یہاں تہذیت جدید کے موافقین بھی غلام تھے اور مخالفین بھی غلام۔ فلسفی اور ادیب بھی دست نگر تو مذہبی شیوخ بھی کاسہ لیس۔

مقتدر ناموں کی فہرست چھوٹے چھوٹے بونوں پہ چسپاں ہوگئی۔ ملائیت، صوفیت اور لادینیت تینوں ہی مجددیت کے دعویدار ہوئے۔ اور یہ وہ وقت ہے کہ خوابِ عظمت کے مارے ہوئے یہ بیمار اُمتِ مسلمہ کے امراء اور شرفا ٹھہرے۔ ترجیحات کچھ اس طرح بدل گئیں کہ مذہب اپنا کائناتی تشخص کھو بیٹھا۔ ایسے لگتا تھا کہ مذہب اپنی تصدیق کے لیے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کا محتاج ہے۔ تعلیمِ مغرب سے شناسائی علم کا تو نہیں، نسلی افتخار کی طرح نفسی وجاہت کا سبب بن گئی۔ بعض اوقات تو ایک مغربی مفکر کا قول الہام کا رتبہ رکھتا تھا۔

مذہب میں اگر آپ مراقباتی مدارس دیکھیں تو ترسیل خیال ٹیلی پیتھی (Telepathy)' ٹیلی کائناسس (Telekinesis)' کلیروائنس (Clairvoyance) اور روحی پرواز (Levitates) کے مظاہرات عین تصوف سمجھے گے اور نقشبندیہ بزرگوں نے تو کمال کر دیا۔ ترکیب حضوری و وصولی اور جانے کیا کیا اصطلاحات خدا کے رستے کا نشان سمجھی گئیں۔ روشنی کے سات رنگوں پر استوار صوفیانہ مسالک کو یہ بھی علم نہ تھا کہ روشنی کے دو رنگ اور بھی دریافت ہو چکے ہیں۔ خواب عظمت کا یہ عالم تھا کہ ٹرائی پاس (Tripas) کا ایک فاضل جو اپنے شعبے میں شاید وٹ گن سٹائن اور رسل سے بھی بڑا نام ہوتا' سیاست اور انقلاب کا مدعی ہوا اور عمر دیوانگی شعور میں گذار دی۔

سائنسی توجیحات سے متاثر چند ذہین لوگ قرآنی آیات کی من مانی توضیحات پر مُصر رہے اور قرآن مغربی افکار کا چربہ محسوس ہونے لگا۔

بیّت کا تو علم اللہ ہی جانتا ہے مگر احمدی، پرویزی، اور برقی جیسے نوگرفتارانِ زلف مغرب مذہب میں معروضی ہونے کی کوشش میں سادہ اور واضح تفسیرات سے بہت دور چلے گئے اور قرآن بجائے کتابِ تخلیق کے انیسویں اور بیسویں صدی کے مجہول اور مفتون مفکر کی تخلیق نظر آنے لگا۔ امتِ مسلمہ میں یہ خود ساختہ محقق امت کو تاویلات کے ایسے بحران میں ڈال گئے کہ سمجھنے سے نا سمجھنا بہتر ٹھہرا۔

دوسری طرف مذہب کا کلاسیکل مفکر تبع تابعین کے بعد کے فکری دور سے آگے

بڑھنے سے قاصر رہا۔ ابن عباس کا یہ قول بھلا دیا گیا: القرآن یفسرہ الزمان کہ ہر زمانہ قرآن کی اپنی تفسیر کرتا ہے۔ اس کے برعکس تمام علم گروہی بزرگوں کے انتخاب پر قائم ہو گیا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی تفاسیر ناقابل تنسیخ بن گئیں اور عصر جدید سے ان کی مطابقت نہ ہو سکی۔ تاریخِ عالم میں اسلام کبھی شدتِ رجحانات کا مذہب نہیں رہا مگر جب مذہب گروہی، مدرسیاتی اور انفرادی وجاہتوں کا سبب بن گیا تو ایک نئی تفسیرِ مذہب سامنے آئی جس میں برداشت، رواداری، توکل اور اخلاص ناپید ہو گئے۔

مذہب اعتدال اور تہذیبِ نفس کی بجائے محرومیوں اور کمتری کے احساس کا مظہر ٹھہرا۔ آپس کی غلطیاں تو قابلِ برداشت تھیں مگر افسوس اور آزردگی کا باعث یہ ہوا کہ یہ تازہ تفسیرِ مذہب اغیار کی نظروں میں معتبر ٹھہری اور اسی تصور اسلام کو بنیاد بنا کر مغرب کے زاغ وزغن آزادیِ انسان اور حریتِ فکر کے مدعی بن بیٹھے۔ تمام تر تنقید کا رخ اسلام کی بجائے اسلام کی مروجہ وضاحتوں کی طرف کر دیا گیا۔ اسلام کی شناخت مسلمانوں کے کردار سے ہونے لگی۔ بدقسمتی سے دورِ حاضر کے مسلمانوں کا نفاق واضح، ان کی فکری صلاحیتیں مفقود اور ان کا کردار کسی صورت بھی اس نئے چیلنج کو قبول کرنے کے قابل نہ تھا۔ اہل مغرب کی شروع کی عادت تھی اور ہے کہ وہ کمزور پہ رحم نہیں کرتے۔ ان کی حیلہ جو طبیعت نے سازگار اوقات میں امتِ مسلمہ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر چنگیز و ہلاکو کی داستان تازہ کر دی اور اہل اسلام کو اب تک خبر نہیں کہ ان کی دعا غیر مقبول کیوں اور ان کی سعی غیر مشکور کیوں۔ اعمال کی کثرت وشدت کے باوجود فتح نصرت دور اور تائید پروردگار ناپید ہو گئی۔

حکمران سیکولر اور جدید، ملا قدیم اور فکری صلاحیتوں سے عاری، عمومی مسلمان

بے چارگی میں پھر کسی مسیحا کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ وہ اللہ اور رسولؐ کے وعدے پر یقین رکھتا ہے مگر یہ وعدہ جس کردار کا متقاضی ہے، وہ امید، خواہش اور آرزو کے سوا کچھ نہیں۔

اہل مغرب کی سفیدی اور سفا کی اہل مشرق کے متلون رنگوں کے لیے عذاب بن گئی۔ان کی درس گاہوں میں مشرق کے ذہین اور متجسس ذہن تعلیم کے ساتھ ان کے کلچر اور معاشرتی برتری کا احساس لے کر لوٹے۔اب تقسیم کا معیار بدل گیا۔نسلی تفاخرات کی بجائے لسانی اور تعلیمی معیارات سے معاشرہ ترتیب پانے لگا۔سیکولر مزاج نے جو کلچرل برتری کا حاصل تھا' جان بوجھ کر پسماندہ مشرقیوں میں غربت اور احساسِ کمتری کو رواج دیا۔تعلیمی نظام مختلف طبقاتی تقسیم کا باعث بن گیا۔مہذب ہونے کی اس کوشش میں مسلمان معاشرہ مضحکہ خیز لگنے لگا۔ہر گلی ہر کوچہ اس تعلیمی تقسیم کا مظہر بن گیا۔یتیم ویسیر طبقہ کے روزگار کا واحد طریقہ بن گیا۔جس مذہب کی بنیاد دست نگری پر رکھی جائے' ان میں عاملِ قرآن کہاں سے نکلیں گے۔مذہبی متعلّم ترس وترحم کے قابل سمجھے جاتے ہیں اور خیرات دینے والے سیکولر تہذیب کے فراخ دست اور فیاض امراء ؎

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

اقبالؔ بہت رویا مگر بات آنسو بہانے سے آگے جا چکی تھی۔وہ امتِ مسلمہ کا بحران

تو حل نہ کر سکا مگر قائد اعظم کے ساتھ مل کر برصغیر کے مسلمانوں کو ایک ایسے ملک کی تشکیل میں مدد دے گیا جہاں کم از کم مسلمانوں کو عملی احساس کمتری سے تو نجات مل گئی، مگر جہاں تک ذہنی مفلسی کا عالم تھا، وہ آزادی کے بعد اور بڑھ گیا۔ صدیوں کے بعد حریتِ فکر و عمل کے یہ دو مدعی علم و کردار کی نئی جہت روشن کر گئے۔ مگر ذہنی ابتری کا وہی عالم رہا۔ غلامانہ ذہنیتوں کا فسوں کارگر رہا اور بجائے امت مسلمہ کا ہمہ گیر تصور ابھرنے کے مذہب اور تقسیم ہوا۔ مسلمان مزید بکھر گے۔ مجبوری اور محکومی اور بڑھ گئی۔ 70 سال کے بعد بھی مملکت خداداد پاکستان نوزائیدگی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اسلام اپنے گھر آ کر بھی جلا وطن ٹھہرا۔ Tin Packed مذہب نے اس عظیم شعوری تحریک سے جدائی اختیار کر لی جس کی دعوت محمد رسول اللہؐ نے پندرہ سو برس پہلے اجہل ترین انسانوں کو دی۔ استاد عالی مقام کی استقامت اور تائید ایزدی سے جو اسلام محبوبِ خلائق بھی ہے اور مسجود ملائک بھی، دور حاضر میں اپنی ترجیحات سے محروم ہو گیا۔

آدمؑ سے محمد ﷺ تک مذہب کو شرائع کی تبدیلی کے ساتھ مختلف اقوام میں رائج ہوا مگر اس کی بنیادی اور اولیں ترجیح صرف اللہ تھا اور ہے۔

شرع تو معاشرہ کی محفوظ چار دیواری ہے تا کہ لوگ معاشرتی، معاشی اور اخلاقی تحفظات میں مذہب کی اصل غرض و غایت تک پہنچیں۔ شرع تو دنیا کے دوسرے نظامات کے مقابلے میں ایک خدائی نظام جو عدل و انصاف، معاشی تحفظ اور اخلاقی اوصاف پیدا کر کے اگر تمام لوگوں کو نہیں تو کچھ کو ضروری نظریاتی مقاصد عطا کرتی ہے، جس میں محکوم اور

حاکم کوئی اختیارات سے تجاوز نہیں کرتا۔شرع زندگی کے ہر شعبہ میں مداخلت کرنے کے ساتھ ساتھ کم سے کم مزاحمتی (Least Friction) ادارے تخلیق کرتی ہے جو انسانوں کے اندر طبقاتی اخلاقیات کے باوجود انہیں عزتِ نفس کا یکساں مقام عطا کرتی ہے۔اس عزت نفس کا تعین دنیاوی مال واسباب یا اقتدار کے درجات سے نہیں بلکہ یکساں بندگی پروردگار سے ہے۔

ہر نظام اپنے تمام تر شعبہ جاتی تعرفات سے مکمل ہوتا ہے۔کوئی بھی نظام' چاہے سوشلزم، کمیونزم ہو یا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام' اپنے اندر کسی دوسرے نظام کو مداخلت کی اجازت نہیں دیتا مگر ہماری اپنی بے چارگی کا یہ عالم ہے کہ ہم اسلام کے بیشتر اہم ترین نظام معطل کر کے معدودے چند ذاتی اعمال تک محدود کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم مسلمان نہیں۔وجہ یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود ہم اللہ کی حاکمیت کُلّی پر اعتبار نہیں رکھتے اور اس کے بنائے ہوئے معیارات کو دورِ حاضر میں پسماندہ خیال کرتے ہیں۔شرع وہ ابتدا ہے جس سے ہمیں اپنے اعمال پرکھنے کا موقع ملتا ہے جس کی ظاہری ترتیب کے بعد ہم مذہب کی اصلی اور اہم ترین ترجیح کو پلٹتے ہیں اور وہ ہر انسان کا خدائے بزرگ وبرتر کے ساتھ داخلی اور ذاتی تعلق ہے۔مذہب خدا کے لیے اور مذہبی نظام لوگوں کے لیے۔مذہبی نظام اللہ کا لوگوں پر صدقہ ہے۔معاشرہ اللہ کے دیئے ہوئے نظام سے بتدریج ترقی پذیر ہو کر صلاحیتِ عرفان پر پہنچ سکتا ہے۔

مسلمان معاشرہ کے سائنسدان، فلسفی، ادیب اور دانشور ہی ترجیحِ اول کا ادراک

کر سکتے ہیں۔ اگر کسی دوسرے معاشرے میں یہ ترجیح مفقود نظر آتی ہے تو وجہ بھی ظاہر ہے۔ ان کے نظام اس اہلیت سے عاری ہیں کہ خدا کا حقیقی شعور اجاگر کر سکیں یا کسی کے دل میں اس عالمگیر انس و محبت کی شمع روشن کر سکیں جو کسی بندہ خدا کو احسن تقویم ٹھہرائے جس کی وجہ سے دعائیں قبول ہوں، بارشیں برسیں، زمین پوشیدہ خزانوں کو اجاگر کرے، نیابت اللہ کا حق ادا ہو، جنت میراثِ مومن ہو، شرع شروعات ہے اور مقصود و مطلوب۔ اب اگر ترجیحات کے یقین میں فرق پڑ جائے اور لوگ اپنی چند روزہ عبادات و اشغال ہی کو مطمحِ نظر بنالیں تو اصل مقصد دور چلا جاتا ہے۔ کس لیے جیتے ہیں، ہم کس کے لیے جیتے ہیں۔ یقیناً شرع کے لیے نہیں۔ بھلا راستہ کب منزل بن سکتا ہے۔ کیا تمام مذاہب متحارب نظریات کے درمیان نہیں پیدا ہوئے۔

مذہب جب محض رسم و رواج رہ گیا، خدا کی طرف جانے کی بجائے وہ ذاتی اور سماجی شہوات کا شکار ہو گیا تو ترجیح اول کے نسیان کے ساتھ ہر مذہب علمائے مذہب کے کم تر تعصبات کا شکار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ یہ تعصبات سنگ و خشت کے اصنام سے بھی زیادہ سخت اور مکروہ ہو گئے۔ اتنے کہ پیرانِ قدس کے آنسو بھی انہیں نرم نہ کر سکے اور عذاب کے سوا زمین صاف کرنے کا کوئی چارہ نہ رہا۔ اللہ نے انسان کو معمولی منفعت کا سودا نہ دیا تھا۔ کہاں ستر یا سو سال کی زندگی اور کہاں ارب ہا ارب کی خلافت جنت۔

کہاں گئی عقل انسان کی حقیقت پسندی اور معروضیت؟ اعداد و شمار کے پجاری حواسِ خمسہ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ عقل تو پھر حواسِ خمسہ سے کچھ آگے ہی ہے۔ یہ اپنی بنائی

ہوئی ایجادات سے مسحور "عشق نا پید و خرد می گزدش صورت مار"۔

نشہ استکبار ہمیں شیطان کے نسلی تفاخر کے مقابل تو لا سکتا ہے مگر چشمۂ رحمتِ پروردگار کے مضافات میں بھی اترنے نہیں دیتا۔ قبر تک کی مہلت قبر تک رائیگاں گئی۔ سوائے اس کے ایک بہت بڑی چادرِ غفلت و نسیاں نے ان کی عقول کو ڈھانپ لیا ہو اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور یہی حقیقی مطلب ہے اس قرآنی آیت کا کہ اللہ ان کے دلوں میں اور قبولِ حق میں اوٹ بن جاتا ہے۔ مگر کیوں؟ کیا اللہ نہ چاہے گا کہ ذہین، فطین اور محنت کش لوگ اس کی طرف مائل ہوں، اقرارِ وحدانیت کریں، بندگی کے منصب پر پورے اتریں۔ اس کا جواب شاید تاریخ یہود و نصاریٰ میں ہے۔ تیس صدیوں کی معلومہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان لوگوں نے عقل و ذہانت کو جبلی خواہشات کا غلام بنائے رکھا۔ حرمت تصورِ خدا کی توہین کی۔ بت تو نہیں مگر آپ خدا کے شریک بن بیٹھے۔ اس کے رشتہ دار اور اقارب تخلیق کیے۔ اس کی اولاد بنائی۔ اس کی نسل کا اجراء کیا۔ خطاؤں کی پردہ پوشی کی بجائے ان کے اشتہار دیئے۔ مکر و فریب کے تار و پود بکھیرے۔ خدا کی جان بوجھ کر تحقیر کی اور اپنے آپ کو معززتر کیا۔ اگر جینیاتی تعلق مؤثر ہیں تو زمان و مکاں کی تبدیلی زیادہ مؤثر نہیں نکلی۔ دورِ حاضر میں شریعتِ پیمبر کا مذاق اور اپنی عقلیت پرستی کا معیار ٹھہرایا۔ قومِ عاد و ثمود کی روش کا اعادہ کیا۔ خود شناسی کی بجائے تمرد و سرکشی اور خود غرضانہ نام و نمود کی حوصلہ افزائی کی۔ حرام کو حلال کرنے میں جس دیدہ دلیری سے کام لیا۔ وہ انہی کی تاریخ کا تاریک باب ہے۔ شیطانی یقین کی رنگ و نسل پر ذہنی برتری کی بنیاد رکھی۔ مکر و فریب اور ریاکاری کے انداز کی بنیاد چانکیہ اور میکیاولی کا فلسفۂ سیاست تھا۔ ظلم و ستم میں صحرائے گوبی کے خونخوار منگولوں

سے بھی بازی لے گئے۔ مقاصد برآری کے لیے بھیڑیوں کے غول بن گے اور معصومیت کا یہ عالم کہ اپنے آپ کو دنیا کی تہذیب یافتہ اور متمدن قوموں میں شمار کیا۔ وقت نے بتایا ہے کہ مغرب کے مہذب اور شائستہ رویوں کے پیچھے انتہائی ابتدائی جنگل کا جانور ہمیشہ موجود رہا۔ علم وادب کے تمام نقاب بھی اس تعصب اور سفاکیت کو نہ چھپا سکے جو صدیوں سے ان کے اذہان کی بنیاد ہے۔

آزادیٔ رائے اور تحفظِ حقوق کی صدیوں کی جھوٹی روایات دورانِ زمانہ کے ملبے میں دب گئیں اور پھر وہی چہرہ، وہی عادت، وہی اندازِ جاہلانہ اور عاداتِ عاجلانہ، دوہرے قانون، دوہرے نظام، دوہری شخصیتیں، دوہرے چہرے۔ اصل خودغرضانہ واحمقانہ۔ مختصر وقفے میں تاریخ اپنے اعمال دہراتی ہے۔ جرمنی کو قتل یہود کے احساسِ جرم کی سزا اب بھی مل رہی ہے مگر ہیروشیما اور ناگاساکی کے قاتل آزاد۔ مکروفریب آشکار ہونے کے باوجود مغربی فکر کے سرکردہ حکمران دانشور طاقت اور انصاف کو ہم معنی قرار دے رہے ہیں۔ طاقت صحائفِ حکمت وانصاف لکھ رہی ہے۔ مظلوم اسے جبرِ تقدیر سمجھ رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ بات اب زمین کی حکومت سے آگے بڑھ گئی۔ بات اب خدائی کی ہے۔ یک حکومتی تصور اب اقوام متحدہ کے باہمی اشتراکی تصور سے آگے بڑھ گیا ہے۔ زمین کے خدائے واحد کا نظریہ قائم ہونے کو ہے مگر اس خدا کا وجود رحم وکرم پر نہیں بلکہ طاقت اور کثرتِ اسباب پر ہے۔ کوشش یہ ہے کہ پیغمبرانہ تعلیمات اور اوصاف عبادت واخلاق کو مکروفریب کی روایات کے ساتھ مسخ کیا جائے۔ آسمانوں کی حکومت کو زمین کی امارت سے بدل دیا جائے۔ یہی تو دجل ہے۔ یہ کفر سے بڑی تکفیر ہے۔ خدا کا انکار بجا مگر نمرود وہامان کی طرح

خدا سے جنگ کا عزم ہی تو دجال کا طیرہ ہے۔ ربوبیت کی نئی تاریخ اہلِ تسلیم کے لیے وظائف اور افراطِ رزق اور انکار کرنے والے کے لیے آگ اور کشت وخون۔ ہزارہا سال کی سہل پسندی، تیس صدیوں کی مسافت میں انسان پہیے اور بارود تک پہنچا مگر ایک صدی میں انسان قتل وغارت کے مہیب آلات بنا کر بیٹھا ہوا ہے۔ ذہن کی یہ سرعت پذیری معتدل تو نہیں، قوت وعظمت کا شزوفرینیا (Schizophrenia) اعتدال کی حدوں سے گذر چکا ہے۔ اب اس تافلۂ سالار کو کوئی حادثہ، کوئی بڑا دھماکہ، قیامت سا کوئی سانحہ ہی معتدل کر سکتا ہے۔ اس امکان کی قربت سے دلِ انسان لرزاں اور ترساں ہے، مگر وہ جسے سوچنا چاہیے۔ انسان افتاں وخیزاں اپنی منزلِ ہلاکت کو رواں ہے۔

لوگ شاید بغیر ضرورت خدا کا احساس نہیں رکھنا چاہتے۔ شاید جان بوجھ کر ہم اس حقیقت کو پس خیال ڈال دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ خیالِ خدا ہمیں ہر معاملے میں ایک ایسی پابندی سے آشنا کرتا ہے جو کم از کم نفسِ انسان کو تو گوارا نہیں۔ ایک صاحب نے مجھے کہا کہ چالیس برس کا تو میں ہو گیا ہوں۔ مجھے ابھی تک تو خدا کی کوئی ضرورت نہیں پڑی۔ مجھے کیا پڑی ہے' اس کے بارے میں سوچنے کی۔ آپ یقین جانیے کہ مجھے وہ خوش نصیب نہیں لگا اور نہ اچھے مذاق ہی کا مالک لگا۔ مجھے لگا کہ اگر حماقت کا کوئی جسم ہوتا تو ایسا ہی ہوتا۔

کچھ حضرات ناک بھوں چڑھائے رکھتے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہی احساس ہوتا ہے کہ یہ خدا سے معذرت نکلوانا چاہتے ہیں اپنی تخلیق پر۔ ویسے بعض اوقات اللہ پر بھی تعجب ہوتا ہے۔ خالق کی یہ بلندی اور تخلیق کی یہ پستی۔

تعلیمی اداروں میں بحران ذرا مختلف ہوتا ہے۔ بے وقوف عورتیں فکرِ جدید کے تاثرات سمیٹے ہوئے باغیانہ مزاج کے ذہین لڑکوں اور استادوں کے مکر و فریب کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جان ڈن (John Donne) کی طرح مابعد الطبیعیت کے مباحث

جہاں ایک طرف نفسیاتی ترفع اور برتری کا باعث بنتے ہیں، وہاں ٹوٹتے پھوٹتے ہوئے جنسی ہارمونز تقریبِ ملاقات کا باعث بھی بنتے ہیں۔ علم کے ہر شعبے میں ملائیت اور لادینیت کے علماء آپس میں برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ سازش، مکر و فریب، شکایت، غیبت ہر دو اطراف کا محبوب مشغلہ ہے۔ اداس جوان نسلیں ملائیت کا ساتھ دیتی ہیں اور فراخ اور آسان نوجوان لادینیت کا ساتھ دیتے ہیں۔

حیرت کی بات دیکھئے کہ پاکستان میں "ایشیا سبز بھی ہوا اور ایشیا سرخ بھی ہوا" مگر دونوں رنگوں کا ایشیا اور کم از کم پاکستان پر کوئی اثر نہ ہوا، البتہ اخلاقیات ضرور بدل گئیں۔ سوشلزم اور کمیونزم نے صرف اخلاقی Dogma کے اس حصہ پر حملہ کیا جس کا تعلق عورت اور مرد کے تعلقات کی اکائی سے تھا۔ آزادانہ ملاقات، پرانے سماجی ماحول سے رہائی، حیا اور پردہ سے بغاوت، کسی نہ کسی سطح پر جسمانی نمائش کی حوصلہ افزائی، مرد و عورت کی برابری کا تصور، رومانوی ترغیبات اور گاہے گاہے ایک دو پسند کی شادیاں اس پورے ڈرامہ کا انجام ہوتا۔ مغربی انداز فکر اور کلچر سے متاثر چند مادر پدر آزاد اساتذہ نے جدید جنسی رویوں کی تشہیر کو فرض جانا۔ ملائیت کے حجروں کی طرح ان آزاد منش استادوں کی ذاتی نشست گاہیں بھی ہنسی مذاق، ڈھول دھپا اور جنسی چہلوں کا شغل بن جاتی ہیں۔ ان اساتذہ نے تحقیق اور جستجو کے میدان میں سوائے Ph.D کے تھیسس کے کبھی اور کوئی اضافہ نہیں کیا۔ ان کا اثاثۂ زندگی یورپ کی درسگاہوں کے وہ تاثرات ہیں جن میں کوئی نہ کوئی احساس کمتری ضرور نظر آتا ہے۔ یہ حضرات تعلیم سے کم متاثر نظر آتے ہیں، طرزِ حیات مغرب کے زیادہ اسیر ہوتے ہیں۔ یہ علم سیکھنے کے نااہل ہوتے ہیں۔ آپ خود سوچئے کہ جس کو اتنا بھی پتہ نہ

ہو کہ میں نے یہ علم سیکھ کر کہاں استعمال کرنا ہے' وہ کیسا طالب علم ہوسکتا ہے۔

بہت کم کسی مضمون میں ہمارے یہ عظیم مغرب نواز اساتذہ کسی تحقیق میں اضافہ کے قابل ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے نام سے کئی شادی گھروں، بیوٹی پارلروں اور پبلک تفریح گاہوں کا افتتاح ہوسکتا ہے۔ یورپ اور امریکہ جاتے ہوئے یہ ملائیت کے Status پر قائم ہوتے ہیں۔ واپسی پر یہ لادینیت کا لبادہ لیے ہوتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انگریزی زبان اور امریکی محاورہ گفتگو اس کلاس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور سب سے بڑی حیرت کا باعث یہ ہے کہ تعلیم اگر اردو یا کسی علاقائی زبان میں دیں تو وہی قدیم ملاّ لگتے ہیں۔ تعلیمی ادارے تعلیمی اقدار کی بجائے حکومتی اشارات کے محتاج ہیں۔ کوئی بھی سربراہ عموماً اس احتیاط سے چنا جاتا ہے کہ وہ کوئی آزادانہ رائے کی حوصلہ افزائی نہ کرے۔ Think Tank دراصل خوشامدیت اور جی حضوریت کے اجتماع ہوتے ہیں' جنہوں نے ہر حال میں وقت کے حکمران کی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا ہوتا ہے اور عام اعداد و شمار ان کے ہاتھوں مسخ ہو جاتے ہیں۔ اہل اسلام کی تمام تر زبانیں اپنے حکومتوں کے اقتدار کی قصیدہ گو رہتی ہیں۔ مذہبی محکمہ اور وزارتوں کے حصول کے لیے علمائے مذہب خدا سے بھی بغاوت کر سکتے ہیں' فتوے بدل سکتے ہیں' شریعت میں تحریف ہوسکتی ہے' حدود اللہ کی تنسیخ ہوسکتی ہے۔ اپنے اپنے ماحول میں کبھی کبھی کسی عالم کی اچھی تقریر کی شہرت سننے میں آجاتی ہے۔ کسی نئے فلمی گیت کی طرح کوئی مولوی تفریحِ سماعت کا سبب ضرور بن جاتا ہے۔ کچھ کے بلند و بانگ لہجے عوام میں مشہور ہو جاتے ہیں۔ مگر حیرت کی بات ہے' کوئی مولوی صفائے قلب اور کردار کی کسی خوبی کے لیے کبھی مشہور نہیں ہوا۔

نہ جاننا معمول کی بات ہے مگر جاننا سحر ہے۔ ذہن انکشافات کی دہلیز پر خیالات کے تموج میں احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی کیفیات کو غیر معمولی سمجھتے ہوئے اپنی صفات میں اہلیت کا ناقص خیال پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندازِ زندگی میں بھی نو وارد خیالات کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے۔ انسان اپنی ہی ترقی اور تعرجِ خیال کو سنبھال نہیں پاتا۔ دیکھنے میں یہ اکثر نارمل انسان درونِ ذات اپنی فکر کے جداگانہ استدلال کی زد میں ہوتے ہیں۔ وہ ہر خیال کو ذاتی اور شخصی صفت سمجھتے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ہر خیال اس طرح نسب و کسب کا مالک ہے جیسا کہ دنیا کی باقی اشیا۔ خیال اکیلے نہیں ہوتے۔ یہ بھی رشتوں میں منسلک ہوتے ہیں۔ ان کے بھی آباؤ اجداد ہیں، نسلیں ہیں اور ایک خیال کے آتے ہی اس کے خاندان کے بارے میں جاننا مشکل نہیں ہوتا۔ انسان کی عقل خیال کی آزمائش سے مشکل سے گذرتی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں سے بغیر خدا کی محبت اور خوف کے کوئی سلامت نہیں جاتا۔

خیالات، احساسات اور جذبات کی دنیائیں ظاہری سائنسز سے زیادہ پیچیدہ اور

نا قابلِ فہم ہیں۔ انسان ان کے الجھاؤ میں اپنے بیشتر تحفظات موقوف کر دیتا ہے۔ خیال خواہ عظمت کا ہو یا کمتری کا، محبت کا ہو یا نفرت کا، جرأت آرزو کا ہو یا تموج جذبہ کا' بے خطر انسانی ذہن میں اپنی جگہ بناتا ہے اور ذہن چناؤ کے عمل میں کسی احتیاط سے کام نہیں لیتا۔ جاننا سحر ہے اور یہ وہ سحر ہے جس سے ہم بصد شوق مسحور ہوتے ہیں۔ اسے اپنی اعلیٰ قدر اور فضیلت جانتے ہوئے اس فخر و مباہات کا اظہار کرتے ہیں۔ ادیب جب اپنے آپ کو کسی خوبصورت جملہ یا کیفیت کا حامل دیکھتا ہے' تو از خود اس کے دامِ فریب میں الجھتا ہے اور سب سے پہلے تو اپنے آپ کو عجیب اور تنہا سمجھ کر نازاں ہوتا ہے۔

خیالات کا یہ عُجب اسے عمومی زندگی سے علیحدہ کر دیتا ہے اور وہ اعتدال فکر و خیال کو عمومی رویہ سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ شعراء، ادبا اور فنکاروں کی زندگی میں اعتدال ناپسندیدہ مزاج سمجھا جاتا ہے۔ یہ رویہ ایسے غیر معقول اور غیر عملی رجحانات کو جنم دیتا ہے' جو فطری قوانین سے انحراف کا باعث بنتے ہیں۔ باقی لوگ بھی چونکہ اس قسم کے غیر معمولی اثرات کی خواہش رکھتے ہیں' اس لیے یہ عمومی لوگ ان کو نابغہ اور جینیس سمجھتے ہوئے ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ عموماً اس جرأت رندانہ کی زد میں وہ قوانین آتے ہیں' جنہوں نے زمانہ غار سے لے کر آج کے متمدن معاشرے تک انسان کی بقا میں مدد دی ہوتی ہے۔ انارکی تصور کی غیر ترتیب یافتہ شکل ہے۔ یہ ترجیحات کی تردید ہے اور مجموعی زندگی کو انفرادی تاثرات سے بدلنے کی کوشش ہے۔ تحریر و تقریر کی آزادی کا تصور بھی اسی بہیمانہ انارکی کا ایک حصہ ہے۔ پیغمبرانہ اخلاق اور ذہانت ہی اس آسیب سے نجات یافتہ ہوتی ہے۔ بلاشبہ ہر پیغمبر اپنے زمانہ کی بہترین عقل کا وارث ہوتا ہے۔

پیغمبر اس قسم کے شخصی عقلی انحراف کے نتائج سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں' جیسے کوئی کتاب اللہ میں تحریف کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح ذہین انسانوں کا یہ طلسم آئینہ بند گروہ انسانی خیالات کی مکمل تحریف کا باعث بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک عقل انسان نے نسل انسان کو کوئی اخلاقی نظام نہیں بخشا' بلکہ اخلاقی نظام میں تنقیص کا جرثومہ پھیلانے والے یہ لوگ آزادی اور حرمت کے نام پر بدترین اخلاقی جرائم کے بانی ہوجاتے ہیں۔ مہذب بننے کی خواہش بجا سہی لیکن اگر تہذیب کی مراجعت دیکھی جائے تو محسوس ہوتا ہے' یہ عام مفکر انہی برباد شدہ نسلوں کے علمی وارث ہوتے ہیں جن کی وجہ سے زمین میں کثرت سے آثار قدیمہ بکھرے پڑے ہیں۔ یہ لوگ باقی رہنا چاہتے ہیں' نام زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور خواہش رکھتے ہیں کہ تا ابد دنیا انہیں یاد رکھے۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ بابل کے کھنڈرات' پومپائی کی ہلاکت زدہ زمین، موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے آثار قدیمہ کے ادیب کیوں نہ زندہ رہے۔ کیا یہ معاشرے ان ادیبوں اور مفکروں سے خالی ہوں گے۔ افسوس کہ کسی شاعر کی بیاض اور کسی ادیب کا مقالہ اور کسی فلسفی وقت کا نام اور کلام ان اوندھی بستیوں' ٹوٹے ہوئے مکانوں، اجڑے ہوئے محلات اور سوکھے ہوئے کنوؤں سے نہیں نکلا۔

مگر آج کا انسان بھی کچھ بہتر نہیں۔ وہ تباہیوں کے اس پس منظر سے درس عبرت سیکھنے کی بجائے ان آثار قدیمہ سے صرف میوزیم اور ڈرائنگ روم سجانے کا کام لیتا ہے۔ صحت اور اعتدالِ عقل کے وارث پیغمبروں کا استہزا کوئی نئی بات نہیں۔ طنز و تشنیع' جور و ستم اور مکر و فریب کی روایات سے ہر پیغمبر اور رسول کا واسطہ پڑا۔ کچھ کو جہالت کے ان علماء نے

تہ تیغ بھی کیا۔ کچھ کو سولی پر چڑھانے کی بھی کوشش کی۔ مگر طرفہ تماشا یہ ہے کہ بجائے یحییٰ کے تزکیہ اور صبر کی داد دینے کے سلومی کے فحش اعمال کو باعث ترجیح سمجھا گیا۔ انسان نے آج تک شاید ٹریفک لاء کے قانون کے کوئی سہولت انسان کو نہیں بخشی۔ نہ صرف یہ کہ اس مسحور عقل نے انسان کے واحد طریق نجات کو چھینا اور ایک بے صبر، بے بصیرت اور بے آبرو معاشرہ کی بنیاد رکھی بلکہ اپنی خودغرضانہ اور جبلی تحریکات کی بدولت انسانی معاشرہ سے یادداشت، نیند، امن وسکون اور قرار قلب بھی چھین لیا۔ خیال و ایجاد کی تحریکات نے ترجیحِ اول کو ایسے بھلایا کہ پوری نسلِ انسان عالم سکرات میں لگتی ہے جس کو اب یہ یاد نہیں کہ کوئی کھوئی ہوئی منزل اب بھی اس کے انتظار میں ہے۔

اعداد وشمار کی اس بے بصر کائنات میں تمام عقلی توضیحات جبرِ مسلسل کی طرح نسلِ انسان پر مسلط ہیں۔ یہ وہ المیہ ہے کہ جو انسان فکری رہبر خود اپنے اوپر مسلط کر رہے ہیں، مگر خدائے کائنات کا تصور دورِ حاضر کی عقلیت کا سب سے بڑا آسیب ہے۔ باوجود کوشش کے انسان اپنی عاقبت کے خوف سے لرزہ براندام ہے۔ موت اگر ایک بار ہوتی اور موت کے بعد کچھ نہ ہوتا تو بھی انسان آزاد ہوتا مگر آسیبِ مرگ سے تو کوئی ذی حیات آزاد نہیں اور یہ عفریت انسان کو حسرت ویاس کے بے کراں سمندر میں دھکیل رہا ہے۔ کبھی کبھی بجلی کی چمک جب ٹوٹی ہوئی پتوار والی کشتی کے مسافر پر پڑتی ہے تو اسے مذہب میں روشنی نظر آتی ہے ورنہ پھر وہی مہیب سمندر، وہی اتھاہ تاریکی، وہی ہولناک موجیں۔

رہِ فکر میں سب سے بڑی خطا طمانیت ہے۔ ارذل عمر تک پہنچنے سے پہلے اگر فکری سفر ختم ہو جائے اور انسان اپنے آپ کو مکمل سمجھ لے تو اس سے بڑی خطا اور شاید گناہ کوئی نہیں۔ فکر دریائے رواں کی طرح ہے۔ رطب و یابس کا اس میں ملنا عین فطرت ہے اور تکمیل شاید کبھی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ صاف شفاف پانی کا چشمہ بھی اگر رک جائے تو سڑاند کا شکار ہو جاتا ہے۔

دنیا کے تمام مقاصد فکر کو محدود کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ جزوی عقلی استعداد کہیں نہ کہیں اپنی حدود تک پہنچ جاتی ہے۔ عقل جہاں رکتی ہے، بت خانہ تعمیر کر لیتی ہے اور باقی ماندہ عمر انہی حدود و قیود میں گذارتی ہے جہاں سے بڑھنا اس کا مقدر نہیں ہوتا۔ مگر ایک راستہ یقیناً ایسا ہے جس میں عقل محدود نہیں ہوتی۔ علم و عقل تمام تر تجسس کے ساتھ ہے اور جستجوئے مزید کے بغیر ایسے بھوکے معدے کی طرح ہے جو اپنے آپ کو چاٹتا ہے۔

اگر دل کی دو لیا دِ خدا ہے تو عقل کی روانی تصورِ خدا سے ہے۔ عقلِ کُل اور علمِ مکمل

کی تحصیل ناممکن سہی مگر اس کے قریب تر ہونے کی خواہش معراجِ دانش ہے۔ اللہ کے بغیر عقل ٹھہراؤ کا شکار ہو جاتی ہے اور اس میں ایسی طمانیت پیدا ہو جاتی ہے جو محبتِ ذات پر منتج ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن میں اللہ عقل انسان کے لیے چھوٹا وقفہ مختص کرتا ہے اور اسے "لم" کہتا ہے مگر تواردسے ٹھہراؤ دراصل مزید فہم وفراست کے لیے قاتل ہے۔ شناخت الٰہیہ کے سوا تمام علوم کا روبارِ حیات پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کو علم کہنا بھی دراصل محال ہے۔ دنیاوی مہارتوں کے مظہر اذہان بالآخر افسردگی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ اسی طمانیت کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے مزید فکری گہرائی اور گیرائی تک پہنچنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

صدیوں سے انسان گناہ وثواب کی ثنویت کا شکار ہے۔ اس کا خوف اسے بار بار کسی جابر وقاہر حکمران کی جواب دہی سے ڈراتا ہے اور ثواب اس کو اعمال میں قید کر کے اس کا ذہنی سفر روک دیتے ہیں۔ شاید یہی ایک بڑی وجہ ہے انکار خداوندی کہ وہ اپنے خوف سے آزادی چاہتا ہے مگر ردعمل کے طور پر۔ سوچنے سمجھنے کے راستے کی اذیتیں اس کے لیے مشکل اور انکار سہل ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اس انکار پر بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ خدا سے آزاد انسانی باطن اس اہلیت کا مالک نہیں کہ کوئی مربوط حل زندگی اور کائنات کا پیش کر سکے۔ خود فراموشی خودشناسی کا نعم البدل نہیں بن سکتی۔ انکار کی یہ روش بھی تنہائی فکر سے خوفزدہ ہے۔ اس کو دور کرنے کے لیے وہ اپنے ہم خیال انسانوں کے تقرب کا شائق ہوتا ہے جو اخلاقی اور ذہنی بحران میں صرف اپنے جیسے لوگوں سے تسلی پاتے ہیں۔

تقلید بھی نصیب کی بات ہے۔ تقلید سے پہلے کی روش اور خواہش ہی فیصلہ کرتی

ہے کہ آپ اولیائے رحمان ہونا چاہتے ہیں یا اولیائے شیطان۔ اگر کسی شخص کو اپنی غلطی کا احساس ہو بھی جائے تو اس اخلاقی جرأت سے تہی ہوتا ہے کہ اس کا اظہار برملا کر کے دوسرے لوگوں کو عذاب فکر سے بچا لے۔ تقلید یا تو اپنی ذہنی صلاحیتوں کا جائز ادراک ہے کہ کچھ لوگ یہ جانتے ہوئے کہ وہ اعلیٰ غور و فکر کی صلاحیتوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے' ان کو رہبری کے لیے کسی نہ کسی بہتر کی جستجو ہوتی ہے یا پھر مقلد اپنے آپ کو کسی محدود طرز فکر کا اسیر کر لیتا ہے۔ یہ دوسری قسم کی تقلید بدترین تعصبات کو جنم دیتی ہے اور بعض اوقات صدیوں تک فہم و فراست کے زوال کا باعث بن جاتی ہے۔ کسی بھی سکول اور مکتب خیال کی چار دیواری بھلا عقل بسیط کے امکانات کیسے سمیٹ سکتی ہے۔ مکاتب فکر اپنی فکری استعداد کی کمی پوری کرنے کے لیے تقدس اور جھوٹے دعاوی کا آسرا لیتے ہیں۔ شکل و شباہت اور رنگ و لباس کی قید نجات کا باعث سمجھی جاتی ہے۔ تقلید محض بات سمجھنا تو دور کی بات ہے' سننے کی بھی روادار نہیں۔ مذہبی اور کم فکر خیالات کے یہ گروہ تسلسل کے ساتھ مقلدین میں ذہنی ارتکازات تخلیق کرتے ہیں۔ ذہنی صفائی (Brain Washing) کا یہ عمل سادہ اور شریف لوگوں کو بھی جنونی اور متشدد بنا دیتا ہے۔ اس میں کچھ ان پیرانِ پارسا اور علمائے کم فہم کا تحفظ بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنے اختیارات کا سودا نہیں کرتے۔ مقلدین پر غلبہ صرف ایک صورت میں ممکن ہوتا ہے کہ وہ مزید سوچنے کے قابل نہ رہیں اور یہ گروہ قائدین برہمن سماج کی طرح بڑی مہارت سے ان میں خوف اور ہراس کی کیفیات پیدا کر کے انہیں اپنے قابو میں رکھتے ہیں اور یہ طریقہ کار نسلوں تک محیط ہوتا ہے۔ تمام مذہب مرشد گرامی اور استاد مدرسہ کے خیالات تک محدود ہوتا ہے۔ ان مدارس سے باہر ایک کائنات کفر آباد ہوتی ہے جس کا خوف ہر مقلد کے ذہن و دل پر سوار رہتا ہے۔

شہادت اب خدا کے لیے نہیں بلکہ مدرسہ کے سنگ وخشت کے لیے ہوتی ہے۔ مذہب تو کوئی بھی جنوں خیز نہیں۔ بھلا اعتدال کی تلقین تشدد پر کیسے ختم ہوسکتی ہے۔ آدم علیہ السلام سے محمد رسول اللہ ﷺ تک کوئی بھی پیغمبر خدا نہ متشدد تھا نہ کم فہم بلکہ تمام انبیاء نے اپنے معاشرتی جبر واستبداد کا سامنا کیا اور لوگوں کی عقول کو رسم ورواج کی قید سے آزاد کیا۔ پھر کسی بھی نبی نے تشدد کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ ویسے بھی عقلِ کُل کے یہ رسول تو لوگوں کو اختیار دینے آئے تھے' جہالتوں کی افسردگی ان کے مناصب سے بہت دور تھی۔ مذاہب جب روشِ اعتدال سے گذر گئے تو کم تر اذہان نے انہیں کائناتی فہم وفراست سے جدا کر کے قبائلی تعصبات اور ذاتی وجاہتوں کا قیدی بنا لیا۔ ہر قوم نے اپنے مذہب کو صرف اپنا سمجھا تو دوسروں کو ذاتی اور مذہبی حریف۔ اہل یہود نے مذہب میں جس خودغرضی اور تعصب کا مظاہرہ کیا' وہ پھر عیسائیت میں نفوذ پا گئی اور اس سے بڑا نقصان اسلام کی عالمگیریت کو پہنچا۔ اسلام بھی پھر اپنے متعصب اور کم فہم علماء سے جانا جانے لگا۔ اسلام کے یہ داعی اسلام کے سب سے بڑے دشمن نکلے۔ قرآن کی بجائے ان علمائے ظاہر کے خیالات ہی جملہ اسلام سمجھے گئے۔ اس طرح ایک انتہائی غلط روایات کی بنیاد پڑی' جو اب تک جاری ہے۔

سائنس کے برعکس جہاں ہر صاحبِ فکر نے دوسرے کا احترام کیا اور تحقیق وجستجو کو آگے بڑھایا' مذہب کے داعیوں نے اپنے اپنے مذہب کو جدا کر لیا اور دوسرے مذاہب کو اپنا حریف جانا۔ کائنات کے سب سے بڑے کائناتی پیغام کو بے عقل اور بے اخلاق لوگوں

نے جنگ وجدل کا ذریعہ بنا کر اپنے اقتدار و اختیار کے راستے ہموار کئے۔ سائنس آگے بڑھ گئی اور مذہب گھر مندوں میں بٹ کر رہ گیا۔ یہود نے عیسیٰؑ و محمد ﷺ کی نبوت سے انکار کیا۔ عیسائیت نے اسلام کا انکار کیا اور اہل اسلام دونوں کے مغضوب ٹھہرے۔ اب اللہ ہر روز تو پیغمبر تخلیق کرنے والا نہیں تھا۔ سوائے عقل کے کوئی شے باقی نہ بچی جو انفرادی سطح پر اس بحران مذاہب سے نکل کر حقیقت جان سکتی اور خدائے واحد کے پیغام کو قبول کر سکتی۔ سوچنے والوں نے اس بحران کا ایک حل یہ نکالا کہ بنیادی سوال سے انحراف کیا۔ مقصد حیات کو پس پشت ڈال دیا اور زندگی کو دنیاوی مقاصد تک محدود کر لیا۔ ایک غلطی تو اہل مذاہب سے ہوئی اور اس سے بڑی خطا دانشمندانِ دنیا سے ہوگئی۔ کیا کوئی سائنسی حقیقت بھی اس بحران کا شکار ہوئی۔ کیا کسی سائنس دان کے ذاتی عمل سے بھی کوئی فارمولا یا کوئی تناسبِ اجزا بدلا۔ نہیں، مگر مذہب کچھ لوگوں کی ذاتی آراء کی وجہ سے اپنی ہیئت تبدیل کر گیا اور لوگ اللہ کو ماننے اور پوجنے کی بجائے ان علماء کے آستینوں کے بتوں کی دہلیز پر جبیں ریز ہو گئے۔

کچھ لوگوں نے بڑی ہمت کی۔ قرآن کی آیات کو بغیر سیاق وسباق نقل کر کے اس میں تضاد کی نشان دہی کی۔ تضاد بڑے مضحکہ خیز تھے۔ کسی آیت میں اللہ نے نرمی دکھائی اور کسی میں قہر وجلال۔ بھلا ان سے پوچھئے کہ کسی انسان میں رحم وکرم کی صفات کے ساتھ غصہ کا ہونا اس کا تضاد ہوگا۔ کیا محنت اور استقامت کی شدت کے بعد آرام کرنا متضاد صلاحیتوں کا حامل ہوگا۔ کیا انسانوں کو رحم وکرم کے ساتھ ان کے سمجھانے کے لیے نار ودوزخ کا ذکر خدا کے رحم وکرم میں نقص پیدا کرے گا۔ کیا ترتیبی مراحل میں تمام کام بغیر مشقت کے طے ہوتے ہیں۔ ان مفکرین نے اپنی عقل وفراست کا جائزہ کیوں نہیں لیا۔ یہ کیوں نہ جانا کہ یہ کتاب حکیم کے فہم کے معیار تک ابھی نہیں پہنچے۔ کیا Ph.D. کی کتاب پانچویں کے متعلّم کے ہاتھ دے دینے سے عقلی حادثات نہیں واقع ہوں گے۔ کتاب اللہ کے دو معیار تو ضرور ہوں گے۔ ایک وہ معیار جو خدائے برزگ وبرتر کا ہے جس کی فہم وفراست سے وہ کتاب مرتب ہوئی اور دوسرا وہ معیار جو اسے کتاب کے سمجھنے کے انسانی ماہرین کو عطا کیا۔

کسی انسان کا خدا کی عقل وفراست تک پہنچنا تو ناممکن ہے مگر اس کی بخشی ہوئی

نعمت عقل و فراست سے مطلوبہ اور لازم نتائج تک پہنچنے کے لیے بھی ایک معیار تو چاہیے ہوگا۔ آرٹس کے ایک پوسٹ گریجویٹ کو سائنس میں اس لیے داخلہ نہیں ملتا کہ وہ اس شاخ علم کی مبادیات سے بھی نا آشنا ہوتا ہے' حالانکہ درجہ علم برابر ہوتا ہے۔ کیا سائنس دان اور فلسفی جب چاہے کتاب اللہ پر رائے زنی کرسکتا ہے۔ جس شخص نے رہِ علمِ مذاہب میں کبھی ایک قدم نہ رکھا ہو' وہ ممکن ہے کتاب اللہ کا مفسر اور مبلغ ہو۔ کیا دورِ حاضر میں تنقیدِ مذہب کا یہ رجحان مضحکہ خیز نہیں۔

دور حاضر میں مذہب ایک پنچنگ بیگ (Punching Bag) بن کے رہ گیا ہے۔ دنیا کے کسی بھی عمل کی کوتاہی مذہب کو بھگتنی پڑتی ہے۔ ہر قسم کی زوال پذیری اور ذہنی افلاس تبدیلی مذہب کے نام ہے۔ جدت پسند اور رجعت پسند اپنی ذاتی اور مزاجی جنگ کے لیے جو اسباب منتخب کرتے ہیں' وہ مذہب اور ترقی ہے۔ ایسے لگتا ہے' دنیا نے اس صدی کے تجربات کا نچوڑ یہی لیا ہے کہ مذہب ترقی کے ہر راستہ کی رکاوٹ ہے۔ دوسری طرف مذاہب کے داعی یورپ میں تو شکست خوردہ ہو کر لادینیت کے رحم و کرم پر ہیں تا آنکہ ایک سخت ردعمل انہیں دوبارہ لڑنے کی صلاحیت دے۔ اور مشرق میں مذہب اپنا مقام چھوڑنے پر راضی نہیں۔ مشرق میں مذہب سے آزادی ترقی کی ہم معنی نہیں ہوسکتی بلکہ غداری' بے ایمانی، مکر و فریب اور خود غرض اقتدار کے ہم معنی ٹھہری' جس کی وجہ سے مذہب نے اپنی بدترین شکل میں بھی لادینیت کو روکے رکھا۔

سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism)، سوشلزم، کمیونزم پر فتح کے نشے میں

سرشار ہے۔ مذہب کے خلاف پوری قوت سے جنگ آزما ہوا' مگر اکیسویں صدی کے اواخر میں سرمایہ دارانہ نظام کو بھی اسلام سے نپٹنے کے لیے اپنے مذہبی تعصبات کا سہارا لینا پڑا۔

یہ جنگ جو مختلف فکری نظامات میں تھی' اب مذاہب اور تہذیبوں کے تصادم میں بدل گئی۔ یورپ کے ایوان اقتدار مشرق کے خودکش حملوں کی تندی سے لرز اُٹھے ہیں اور باوجود بے پناہ ترقی اسباب کے یہ مضبوط معاشرتی اور معاشی ڈھانچے تنکوں کی طرح بکھرتا جا رہا ہے۔ ابتدائے حال ہی میں یورپ اور امریکہ اپنے تمدن کی سب سے درخشاں روایت کو خیرباد کہہ گئے ہیں اور آزادی اور حریت کے قوانین نظر ثانی ہونے لگے ہیں۔ شخصی آزادی کے تصور محدود ہونے لگے اور ہر دھماکہ جو یورپ اور امریکہ میں ہوتا ہے' مذہب سے خوف اور اپنے حفاظتی حصار کی کمزوری کا ہے۔ مغربی تمدن اتنا بودا نکلا کہ اس کی کسی کو امید نہ تھی۔ شائستگی' رواداری اور فراخ دلی کی داستانیں سیاحوں کی زیبِ داستان خرافات لگتی ہیں۔ ان کے رویئے تعلیم یافتہ لوگوں جیسے نہیں رہے۔ ان کے دانشور اپنے مصنوعی قد و قامت سے نکل کر بونے سے لگ رہے ہیں۔ جھوٹ پھر جھوٹ ہے اور شیطان کا مکر بہت بودا ہے۔ تارِ عنکبوت کو بکھیرنے کے لیے حق کا ایک پتھر کافی ہے اور خوفزدہ' ترساں ولرزاں تہذیب مغرب کو اپنے انجام تک پہنچانے کے لیے شاید ایک دو اور حادثے فیصلہ کن نکلیں گے۔ سفاک اور خوفزدہ مغرب نے اس کا انتقام مشرق کی ان کمزور اور بے سروسامان قوموں سے لینا شروع کر دیا۔ قتل و غارت' ظلم و ستم اور فتنہ و فساد کی جو آگ امریکہ نے روشن کر دی ہے' اس کا انجام مسلمانوں کو ان کے مخبر صادقؐ نے بتا بھی دیا مگر وقت گذرنے

کے ساتھ ساتھ یورپ اور امریکہ کو پتہ چل رہا ہے کہ وہ دوزخ کو اسی دنیا میں دیکھ لیں گے۔ عیسائیت کی طرح اسلام اپنے آپ کو کبھی مظلوم نہیں سمجھتا۔ قوم یہود آج تک ہر پیغمبر کے ارشاد کو غلط سمجھتی ہے اور مُصر ہے کہ خدا ان کا ہر کام بدست خود سر انجام دے۔ عیسائیت مظلومیتِ عیسٰیؑ کا بہانہ بنا کر گناہوں سے آزاد (Guilt Free) ہوگئی اس لیے اب مکر وفریب، دھوکہ دھاندلی، ظلم وستم، جبر وہلاکت کی باز پرس اُسے شرمندہ نہیں کر سکتی۔ گناہوں سے نجات یافتہ یہ قوم اب صرف گناہ کرتی ہے۔ انہوں نے مجموعی طور پر جناب عیسٰیؑ کو خاص مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ مظلومیت کا مذہب نہیں۔ ہر دور میں اس کے اندر ایسے توانا اجزاء موجود رہے جو شکست وریخت کے ہر عمل سے گذرنے کے بعد بھی سلامت رہے۔ آج کے دور کا بحران بظاہر تو بڑا لگتا ہے مگر مسلمان اپنی داخلی مزاحمت کے جذبے سے محروم نہیں ہوئے۔ تشدد اور ردعمل کی جولہر ابھی افراد تک محدود ہے، اہل مغرب کی حماقتوں کی وجہ سے اہل اسلام کی اجتماعی جدوجہد میں ڈھل جانے کو ہے۔ قوموں کی زندگی میں صدیاں بھی سال ہوتے ہیں مگر اب شاید سال بھی باقی نہیں ہیں اور واقعات وحادثات قطرہ قطرہ کی بجائے مسلسل آبشار کی طرح گر رہے ہیں۔ زمانہ تطہیر کے مزاج میں ہے۔ انسانی ترقی اور عروج کی اس ناقص توجیہ پر افلاک کا استہزائی تبسم نظر آرہا ہے۔ اب شاید پیشین گوئیوں کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کے لیے بالکل تیار ہے۔

فلسفہ اور مذہب میں بنیادی فرق اعتقاد ہی نہیں ہے۔ فلسفہ جس اعتقاد کو Dogmatic کہہ کر رد کرتا ہے' وہ مذہب کے نزدیک Dogma نہیں ہوتا۔ مذہب جس حقیقت کے بارے میں قطعی وضاحت اور یقین رکھتا ہے' فلسفی اسے قابل بحث اور مشکوک قرار دیتا ہے۔ فلسفی مذہبی نہیں ہوتا مگر بنیادی طور پر کسی نہ کسی ذاتی مذہب کی تخلیق کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ فلسفی اپنی ذات کے اندر بھی ایک بحران کا شکار ہوتا ہے۔ اپنی فکری صلاحیتوں کو دوسروں سے کچھ بہتر پا کر وہ عمومی اعتقادات پر یقین کرنے سے احتراز کرتا ہے۔ مذہب بنیادی تخلیقی اعتبارات پر گفتگو کرتا ہے۔ میں یہ واضح کر دوں کہ مذہب کو کبھی کبھی عمومی مذہبی اعتقادات سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ مذہب ان ذہین ترین لوگوں کی تحقیق اور جستجو کا نتیجہ ہے کہ جنہوں نے مقصدِ حیات اور تخلیق کو اولین ترجیح قرار دیتے ہوئے پوری زندگی علم کے اس اعلیٰ ترین استفسار میں بسر کی اور کوئی بھی پیغمبر یا ولی ایسا نہ تھا جو تقریباً ایک ہی جیسی منازل سے گذرتے ہوئے ایک ہی جیسے تجربات کا سامنا کرتے ہوئے ایک ہی جواب پر نہ پہنچا ہو۔

اور شاید تمام انبیاء، اولیا اور محققینِ مذہب کا خلاصہ ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ ''خدا ہے'' ۔۔۔۔۔ فلسفی کو ہر اس اعتقاد سے ذہنی طور پر اختلاف واقع ہوتا ہے جس پر وہ اپنے غور وفکر سے سند اعتبار حاصل نہیں کرتا مگر زمانہ گذرا کہ تمام فلسفی ایک غلطی کا مسلسل شکار ہوتے رہے۔ اور یہ غلطی اتنے تسلسل سے دہرائی گئی کہ فلسفی کو دانشور اور عقلمند کہنا مشکل ہو جاتا ہے' بلکہ گمان ہوتا ہے کہ اہل فلسفہ ایک ایسا گروہ ہے جنہوں نے ذہنی انانیت کی بناء پر عمومی اعتقاد کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور علم کی ترجیحات کو مجروح کیا اور ایک حتمی حقیقت کو مشکوک اور مفروضہ قرار دینے کی کوشش کی۔ شاید کچھ لوگ فلسفہ کے دفاع میں چند ایک ایسے قول درج کرنے کے قابل ہوسکیں جن میں ان کم فہم عقلمندوں نے حقیقتِ مطلقہ کے بارے میں فکر رسائی کی ہو مگر اس سے ان کی بنیادی حماقت کا ازالہ نہیں ہوتا۔ سائنس دان کو تو شاید اس لیے معاف کیا جا سکتا ہے کہ اس کی تحقیق اور جستجو خالق کی نہیں بلکہ تخلیقات کے بارے میں ہوتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ تحقیق کی کچھ ایسی حدود متعین کرتا ہے' جس سے باہر نکلنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اسی لیے سائنس کو کبھی مذہب کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا اور سائنس دانوں کی تمام مذہبی آراء صرف ذاتی موقف ٹھہرتی ہیں یا پھر جزوی وضاحتِ مذہب۔

مگر اہلِ فلسفہ کی یہ غلطی بخشی نہیں جا سکتی۔ ان کے فکری طرزِ عمل نے انسان کو منزل کے تعین سے بہت دور کر دیا۔ لفظ اور خیال کا طلسم کدہ اتنا طاقت ور ہو گیا کہ عقلِ عیار کی مشعل لیے کوئی عمر بھی اس میں نقب نہیں لگا سکتا۔ کیا عجب ہے کہ سقراط سے لے کر دورِ حاضر کے مفکرین تک اور ناقدانِ مذہب نے بنیادی سوال کی طرف توجہ نہیں کی۔ انہوں نے حقیقتِ مطلقہ کو ہمیشہ داخلی انسانی سوال سمجھا یا پھر اسے انسانی معاشرت اور تہذیب کا

دفاعی تصور خیال کیا۔ کسی بھی فلسفی کی کوئی ایسی شہادت موجود نہیں جس نے وجودِ مطلق کو ایک حقیقی آپشن تصور کرتے ہوئے اس پر برس ہا برس کی عرق ریزی کی ہو اور کبھی کسی حتمی رائے تک پہنچا ہو۔ فلسفہ نے شک و ریب کے امکانات تو بہت وسیع کر دیے مگر اس کا حل پیش کرنے میں ہمیشہ معذور رہا۔ نتیجتاً فلسفہ بھی رو بہ زوال ہوا۔ حتیٰ کہ آج کا فلسفی اپنی بقاء کے لیے اپنی ذیلی شاخوں یعنی نفسیات اور طبیعیات کا محتاج ہو کر رہ گیا ہے۔ اپنے ہی تخلیق کردہ سوال کی بے بسی کا شکار فلسفی قرآن کی اس آیت کا مصداق ہو گیا ہے کہ بے کراں سمندر میں پرانی کشتی پر ٹوٹی ہوئی پتوار کے ساتھ برق و باراں کی تاریکیوں کا یہ مسافر راستہ تو کبھی نہ پا سکا مگر بجلیوں کی چمک اسے کبھی کبھی تھوڑی دور تک سمندر دکھا دیتی ہے اور پھر وہ اور وہی عُمقِ تیرہ و تار۔

مذہب نے کبھی بھی ترجیحِ اول سے دریغ نہیں کیا۔ بلکہ اگر آپ غور کریں تو اپنی مسخ شدہ صورت میں بھی مذہب نے کوئی نہ کوئی الٰہیاتی منصب ضرور تخلیق کیا' بلکہ تمام تر مشرکانہ اور بت پرستانہ معاشرہ بھی ایک حتمی اور اعلیٰ ترین صاحب تخلیق قوت کا ادراک پیش کرتا رہا ہے۔ جیسے وہ اولمپیائی بت پرستانہ نظامِ دیوتائی ہو یا ہندومت کا خدائی کا تصورِ ثلاثہ۔

یہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ یہ تصور کہاں سے پیدا ہوا کہ مذہب محض ایک اعتقاد ہے اور اس میں کوئی ذہنی انکار کی صورت موجود نہیں اور یہ کہ مذہب محض ایک معاشرتی اور سماجی حل ہے۔ کسی معاشرے کے کم تر لوگوں کے صبر و استقامت کا باعث بنتا ہے یا یہ کہ مذہب ایک رہِ فرار ہے جو انسانی کم تری کے رجحانات کی پیداوار ہے یا مذہب ایک افیون ہے جو

زبردست زیردست کو مجبور و مقہور رکھنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مذہب کے خلاف تمام تعصبات غیر اخلاقی رجحانات سے پیدا ہوئے ہوں گے یا ذاتی محرومیوں سے۔

اعلیٰ ترین ذہانت کے سب سے مشکل تجسس کے پیامیروں کو متعصب رویوں کا حامل قرار دینا۔ یہ انتہائی ناقص رائے تھی اور اس غلطی کا تدارک کرنے کی بجائے ان کم تر اذہان نے مذہب پر طنز و تشنیع اور دشنام کی زبانیں دراز کیں۔ اپنی لٹیا تو ڈبوئی تھی مگر جملہ انسانیت کے لیے بھی نجات کا واحد دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ کیا خدا نہیں تھا؟ نہیں ہے؟ کیا ان سب نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا؟ کیا انہوں نے اس انتہائی اہم حقیقت کو اپنی کم فہم عقل سے حل کر لیا تھا؟ کیا ان کو حتمی یقین حاصل تھا کہ اس موضوع کے ساتھ انہوں نے مکمل انصاف کیا؟ یقیناً نہیں۔ خدا فلسفی کا مدقوق تصور نہیں۔ خدا کوئی مفروضہ یا آپشن نہیں تھا۔ خدا ایک ایسی حقیقت تھا اور ہے کہ جس کی تحقیق پر زندگی کے انجام کا دارومدار ہے۔ جس تحقیق کے نتیجہ میں آپ کو کائناتی اور آفاقی وسعت عطا کرتا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ تمام تر انسانی استعماریت اور فکری جبریت کی تاریخ ہے' جس میں مذہبی جبر نمایاں نظر آتا ہے۔ عقلی اجتہاد اور فکری آزادی کی تحریکات کا مرکزی تصور مذہبی استعمار سے نجات حاصل کرنا ہے۔ یورپی مذہبی تحریکات نے مذہب سے آزادی کے لیے جس ذہنی ارتقاء کا آسرا لیا' وہ بھی تعصبات سے خالی نہیں تھا۔ ملائیت اور پاپائیت کی گرفت توڑنے کے لیے جرأت مندانہ فکری اظہار کا پیرایہ اختیار کیا گیا اور بعض مقامات پر تو جان و مال کی قربانیاں بھی دی گئیں۔ دونوں جانب سے ایسی انتہاپسندی کا ثبوت دیا جارہا تھا کہ کوئی بھی مفاہمت ممکن نہ تھی۔

اسلامی ممالک کشادہ روی اور مذہبی رواداری میں مغرب سے بہت آگے تھے' اور سوائے چند ایک استثنائی واقعات کے مذہبی تعصب کی فہرست میں شاید چند ایک واقعات بھی نظر نہیں آتے بلکہ یہی وہ رواداری تھی جس نے عیسائیت کو اپنے مذہبی افکار کی تجدید پر آمادہ کیا اور قسطنطنیہ کی فتح کے بعد جو ترسیلِ علم بغداد اور قرطبہ سے ہوئی' اس نے تاریک دور کے یورپی ماحول کو منور کر دیا۔ مگر تحریکِ اصلاحِ مذہب اور تحریکِ اصلاحِ علوم

بھی اعتدال سے گذر گئیں۔ آزادی فکر کے طلوع شمس نے جہاں تعصباتِ مذہب کے اسرار منکشف کیے' وہاں ایک استہزا اور تحقیر کو بھی رواج دیا جو لاپائیت سے آگے بڑھ کر مذہب کے بنیادی عقائد پر وارد ہوگئی۔ ذمہ داری کے تعین میں اس وقت کے مفکرین نے افراد کے ساتھ عقائد کو بھی اپنی تنقید میں شامل کرلیا۔ بریڈلو (Bradlow) جیسے سیکولر (Secular) علماء نے عیسائیت کی تعلیم میں بیشمار ایسے تضادات ڈھونڈھے جن سے مذہبی حقانیت متاثر ہونے لگی۔

مشرق میں معتزلہ اور دوسرے عقلیت پرست گروہوں نے یونانی مفکرین کی آراء کے زیر اثر اسلام سے انحراف کی گنجائش ڈھونڈی' مگر اسلام کبھی مکمل طور پر لاائیت کی گرفت میں نہیں آیا۔ اس لیے چند ایک عصری توجیہات کے باوجود اسلام اپنے کائناتی اور آفاقی اصول قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔

مذہبی تعلیم چونکہ بذات خود عظیم اساتذہ کے ہاتھ سے نکل کر مقلدین کی فکری پسماندگی کی زد میں آچکی تھیں' اس لیے پندرہویں صدی عیسوی کے بعد ہم مذہب کو تمام تر دفاعی طرز عمل کا حامل دیکھتے ہیں۔ قوت واختیار کے اس مجادلے میں عیسائیت شکست کھا گئی۔ اس کی بنیادی وجہ فکری پسماندگی، رسم ورواج کی تقلید، تعلیمی تغیرات سے ناآشنائی اور عصری فکری اجتہاد کو قبول نہ کرنا تھا۔ عوام کے اذہان پر جو اختیار انہیں صدیوں سے حاصل تھا' وہ کسی قیمت پر اسے ترک کرنے پر آمادہ نہ تھے اور نہ اس میں کسی شراکت ہی کے قائل تھے۔ انقلاب علم وفکر کے اس دور میں چند ایک رکاوٹوں کے باوجود لادینی تحریک نے

مذہب کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔

مشرق میں یہ صورت حال نہ تھی۔ مذہب کبھی بھی مکمل طور پر ملائیت کے قبضہ میں نہیں گیا اور کسی بھی دور میں ملحدانہ کش مکش نے مذہب کو متاثر نہیں کیا۔ اس کی وجہ اسلام کا سادہ اور مؤثر فلسفہ، ابہام اور تضاد سے آزاد پیغام، اس کے فلاح و بہبودِ انسان کے بنیادی نظام، رواداری اور عصری تقاضوں کے مقابل مستحکم تہذیب و تمدن اور فتوحات کا تسلسل تھا۔ معاشی اور معاشرتی نظام، عدل و انصاف اور اہلِ ذمہ کے حقوق کا تحفظ تو بدترین دور اسلام میں بھی متاثر نہیں ہوا۔

اسلام میں کبھی بھی عوامی انقلاب نہیں آیا۔ یورپ کی طرح اسلامی معاشرہ کبھی بقاء کی آخری منزل تک نہیں پہنچا۔ مگر اسلام کے علاوہ جو سب سے بڑی وجہ تھی، وہ قرآن تھا۔ وہ پیغام جو ہر شک و شبہ سے بالا، لفظ اور حرف کے تغیرات سے بالا اپنی ذاتی علمی حیثیت میں کبھی مشکوک نہیں رہا۔ پندرہ سو برس سے اس کے کسی نقطہ اور حرف میں کوئی تغیر وارد نہیں ہوا۔ یہ ایک ایسی حیران کن اور معجزاتی تفریق تھی جس کا کوئی تدارک عقل جدید کے علمبرداروں کے پاس نہیں تھا۔ باقی الہامی کتابوں کے برعکس اس کا الہامی رتبہ واضح اور اس کا علمی معیار ہر تنقید سے بالا تھا۔ قرآن کے مقابل تمام مذہبی کتب شخصی اور ذاتی تاثرات لگتی ہیں۔ اگرچہ کہیں نہ کہیں ان میں خدائے بزرگ و برتر کے احکام اور افکار کی جھلک نظر آتی ہے، مگر انسانی تاثرات کی آمیزش اور آیات کی تحریف نمایاں طور محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان جملہ الہامی کتابوں میں خدا کے احکام سے شناسائی کی جھلک تو نظر آتی ہے مگر زبان و بیان کا

الہامی رتبہ نظر نہیں آتا اور نہ کسی پیغمبر عالی مقام نے اس کی حفاظت اور تقدس کا کوئی طریقہ ہی وضع کیا۔ توریت اور اناجیل کو پیغامِ خدا کا رتبہ تو ملا مگر حرفِ خدا کا درجہ نہ مل سکا۔ اس وجہ سے بعد میں آنے والے علماء کو حرص انانیت اور جاہ پرستی کے حصول کے لیے ان کتابوں میں تحریفِ لفظی کا موقع مل گیا۔ یہی بڑی وجہ تھی' اللہ نے انہیں اپنا پیغام کہا مگر اپنا کلام نہیں فرمایا اور وضاحت سے قرآن میں ارشاد فرمایا کہ میں اب ان تحریف شدہ کتابوں کو سندِ اعتبار نہیں دیتا اور اگر تمہیں میرے احکام کے بارے میں بلاشک وشبہ کوئی سند چاہیے تو وہ صرف قرآن ہے۔ قرآن اور دوسری الہامی کتب کا یہ فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان کا کوئی بھی موازنہ غیر عقلی لگتا ہے۔ عصر حاضر میں جن لوگوں نے الہامی کتب کے موازنہ اور تقابل کا طرز اختیار کیا' وہ غیر معقول اور احمقانہ تھا۔ اہل علم وعقل کے نزدیک اس قسم کی کوئی گنجائش موجود نہیں کہ قرآنی ٹیکسٹ اور باقی الہامی ٹیکسٹ کو ایک دوسرے کے مقابل رکھا جائے۔ قرآن کے مقابل نہ صرف الہامی بلکہ دنیا کی کوئی بھی دوسری تحریر معتبر نظر نہیں آتی۔ اسی وجہ سے اسلام کا عقل پرست طبقہ جدید ترین خیالات کے آلات کے استعمال کے باوجود تحریف کا تو نہیں' مگر تاویل کا قائل نظر آتا ہے۔ جہاں قرآن اپنے مرتبہ صحت کے کلام میں غیر متبدل رہا' تحریف کے تصرف سے آزاد رہا' وہاں شاید ہر زمانہ میں ایک خطرہ سے بھی دوچار رہا۔

زمانوں کے تغیر وتبدل میں، ترقی اور تنزل کے ادوار میں، انسانی خیالات کی ترویج، فکری جدوجہد، تجسس، شکوک وشبہات کے لیے یہ کتاب ایک کھلے درجہ کا چیلنج رکھتی تھی۔ آگہی اور ترقی فکر کے ہر دور میں قرآن تازہ ترین ذہنی انقلابوں کے متقابل رہا اور پھر بھی ہر شکست وریخت سے محفوظ رہا۔ کوئی بھی عصر قرآنی معلومات کو ناقص قرار نہ

دے سکا' مگر یہ کہ بعض ادوار میں انسانی علم ناقص رہا ہو اور قرآنی علوم کے درجہ فراست تک نہ پہنچا ہو۔

ازمنۂ وسطیٰ کی علمی تحقیقات اور علمی انکشافات بذاتہ صحت اور یقین سے دور تھے اور آج کے دن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تمام علوم جو اس عرصہ میں آگے بڑھے اور ترویج پائے' اب قصہ پارینہ لگتے ہیں اور جن حقائق کے بارے میں جو رائے اس وقت دی گئی' وہ معصوم اور جاہلانہ لگتی ہے۔ سوائے اس کے کہ ان کی تحقیق کو ہم داد جستجو دے سکیں۔ ان کے نتائج سے متفق ہونا کسی طور بھی ممکن نہیں رہا۔ قرآن تو نا قابلِ تغیر تھا اور ہے' اس لیے ہر دور کے علماء کو قرآنی تفسیر کے لیے اجتہادی تاویلات سے کام لینا پڑا' مگر علماء کے تعلیمی نقائص کی وجہ سے بعض ادوار میں کتاب حکیم کی کچھ حتمی اور یقینی آیات میں سائنسی اور تحقیقی اعتراض کی گنجائش نکل آئی جس کی وجہ صرف علم و معرفت کی کمی اور تحقیق و جستجو کا تجرباتی دور تھا۔ مگر سائنس اور علمی تحقیق کا جو بھی حتمی فیصلہ انسان نے دیا' وہ تائید قرآن اور اعتراف پروردگار میں تھا۔ اس کے برعکس باقی مذاہب میں اور انکشافِ حقائق میں واضح تضادات محسوس ہونے لگے جس کی وجہ سے باقی مذاہب کے پیروکاروں کے لیے مذہب کی اندھا دھند تقلید کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔

دانشور اور عقلا کی اجلتوں نے مذاہب میں کوئی تخصیص نہ کی۔ یورپی مفکرین اور ان کی تقلید میں بعض مشرقی دانشوروں نے بھی مذہب کو رجعت پسندانہ نظریہ قرار دے کر اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی۔ سائنسی فکری اجتہاد کو مذہب سے متصادم نظریہ قرار دیا۔

جوان علماء کا اپنا حجابِ علم تھا اور اس میں کوئی سچائی موجود نہ تھی۔ قرآنی دستاویز پر سرسری نظر ڈالنے اور اس کے مطالعہ میں غور و فکر نہ کرنے کی بدولت ایک نیا جاہلانہ تقلیدی رجحان پیدا ہوا، جس میں مذہب کو ناقابل عمل درجہ قرار دے کر عصر جدید کے جبلی رویوں کی تائید کی گئی اور کسی بھی عالم نے قرآن پڑھنا اور سمجھنا تضیع اوقات سمجھا۔ قرآن پڑھنے والے بھی غور و فکر کی بجائے تلاوت اور قرأت کے حسن تک محدود رہ گئے۔ کچھ نے حصولِ رزق کے لیے کتاب حکیم کو ذریعہ منتخب کیا اور کچھ نے اپنی ناقص تاویلات کے ذریعہ علم و حکمت کے اس عظیم الہامی ماخذ کو اپنے مدارس کے در و دیوار میں چن دیا۔ محدود فکری صلاحیتوں کے حامل ان مدارس کے اساتذہ نے اپنے علمی استحقاق کو بلند و بالا القابات سے نمایاں کیا۔ اپنی جاہلانہ تاویلات کو تنقید و تنقیص سے بالا قرار دیا اور قرآن کو اپنی خودنوشت تحریرات کے مناصب پر رکھ کر تعصباتِ فکر کی ایسی دیواریں کھڑی کیں کہ امت مسلمہ عرفانِ حقائق کی بجائے وضاحتِ مسائل تک محدود ہو گئی۔

معترضین جو یقیناً ان اساتذۂ مکاتب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ذہین تر تھے، مکتب کے ان اساتذہ کی محدود علمی تاویلات قرآن کا معیار سمجھے اور اسلام کو تعصب اور تشدد کا مذہب قرار دیا۔ عیسائیت اور باقی مذاہب کو تو وہ پہلے ہی رسم و رواج تک محدود کر بیٹھے تھے۔ اب اسلام کی باری آئی۔ کمیونزم، سوشلزم جو پہلے ہی زمانہ وسطیٰ کے جبری اعتقاد کی طرح لوگوں پر وارد ہوا تھا اور جس کی اپروچ صرف مسائل دنیا تک تھی، انہوں نے اسلام کے تمام مابعد الطبیعیاتی اور کائناتی حقائق کو عہد قدیم کی اساطیر قرار دیا۔ اپنے مادیت کے فلسفہ ہی کو حرفِ آخر سمجھا۔ مسلمانوں کی حالت زار اور ان کے عملی مظاہرات کو اپنی کامیابی کی دلیل

بنانا چاہا۔ اسلام کے ساتھ ساتھ چونکہ اس کا مقابلہ لادینی یورپی معاشرتی آزادی فکر اور آزادنہ تجارتی ممالک کے ساتھ ہوا' وہ اپنی کوتاہ بینی اور محدود دنیاوی اپروچ کی وجہ سے یہ جنگ ہار گیا۔

اب اسلام اور لادینی معاشرے آمنے سامنے ہیں۔ اسلام کے پاس آلات جنگ بھی کم اور آلات ذہن بھی کم تر ہیں۔ وسیع تر لادینی معاشرے کی آسانیوں نے انسانوں کو سرعت سے اپنی طرف راغب کر لیا۔ مذہبی اقدار کو حریت فکر اور شخصی آزادی کا حریف قرار دیا۔ عیسائیت کے پاس مصالحت کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے اسے لادینی آزاد معاشرے کے رحم و کرم پر رہنا تھا۔ اس نے جلد ہی مغلوبیت قبول کر لی اور آزاد لادینی معاشروں میں مذہب اب ایک ذاتی رجحان کی طرح زندہ ہے جسے اس حد تک اخلاقیات سے گرنا پڑا کہ ہم جنسی جیسے مکروہ ترین افعال کو بھی سند قبول دینی پڑی۔ اسلام بدستور سربکف ہے۔ اللہ کا دین غیر سے اتنا شاکی نہیں مگر اپنے ماننے والوں کے ریا و کبر کا شکار ہے۔ اعلیٰ مقاصد کے نظر انداز کر دینے کے نتیجے میں امت مسلمہ گروہی آزار میں مبتلا ہے۔ ملائیت کے جبر نے اس میں اخلاص و فکر کی صلاحیتوں کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ مسلمان مذہب کے بنیادی مقصد سے روگرداں ہو کر ہر روز تاویل کے نئے مدرسے تعمیر کر رہے ہیں۔ معمولی اذہان کے لوگ مذہب کو ذاتی وجاہت اور اقتدار کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور اعلیٰ ترین مذہبی درسگاہیں بھی متعصبانہ رویوں کو فروغ دے رہی ہیں۔ دین کو اللہ سے جدا کرنے کا یہ عمل پچھلی ڈیڑھ صدی سے جاری تمام تحریکات' فری میسنری (Freemasonry) سٹائل پر اخفا' ممبر سازی اور شخصی تعلیمی رجحانات کی حوصلہ

افزائی کر رہی ہیں۔ امت مسلمہ لامذہب تو نہیں ہوئی مگر عمومی طور پر مذہبی بے حسی کا شکار ہے۔ وہ اپنے اندر بین الاقوامی رجحانات کی عکاس ہے۔ مذہب کی نسبت دوسرے اقتصادی اور سائنسی اعتقادات کی زیادہ قائل ہے اور واضح طور پر اس خواہش کی مظہر ہے کہ مذہب کی بجائے مروجہ طرز فکر کی پیروی کی جائے۔ کم تعلیم یافتہ اور کم ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے اسلامی حکومتیں مذہب کی بجائے قومیت اور اقتدار کے حصول کی زیادہ خواہاں ہیں۔ چند اشخاص یا گروہ امتِ مسلمہ کے ذہنی رویوں کی قیادت کر رہے ہیں اور یہ زیادہ تر مغربی تصورات کے خوشہ چیں ہیں۔ ان کی اپنی کوئی شخصیت، کوئی نظریاتی ترجیح نہیں۔ یہ کم فہم امراء اور علماء یورپ کی درسگاہوں کے تعلیم یافتہ اور مغربی کلچر کی آزادیوں کے پروہت لادینی معاشرے کی تخلیق کے لیے سرتوڑ کوششوں میں مصروف ہیں اور اسلام کے کوتاہ بیں اور کم تعلیم یافتہ اساتذہ کے مقابل نیا چرچ تخلیق کر رہے ہیں۔ شخصی آزادیوں کے نام پر جدید ابلاغ کے ذرائع شب و روز مادر پدر آزاد معاشرے کی ترویج میں کوشاں ہیں۔ ان کی راہ کا کانٹا بھی مذہب ہی ہے۔

یہ تصادم مشرق و مغرب میں نہیں بلکہ تمام اسلامی ممالک میں ہر سطح پر نمایاں ہے۔ اسلام سربلند ہے اور شاید منتظر بھی کہ قرونِ اُولیٰ کے اخلاص اور صاف و شفاف ذہانتوں کے لوگ کب خدائے بزرگ و برتر کی محبتوں کے علم بلند کر کے اس فطری اسلامی معاشرہ کی تخلیق کریں۔ جیسا پہلے زمین و آسمان میں نہ گذرا ہو۔ جہاں خدائے واحد کی محبت اور شناخت ہی احساسِ مذہب، جہاں جبر و استبداد کی بجائے علم و معرفت کو اقتدار حاصل ہوتا ہے، جہاں چند روزہ دنیاوی زندگی کی اصلاح کے ساتھ لاانتہا بے کراں ماورائی زندگی کی

بھی تیاری کی جاتی ہے جہاں انسان پر موت وحیات کے توارد کے سوا کوئی بے چینی اور اضطراب اثر انداز نہیں ہوتا' جہاں پر برکت ورحمت کے الفاظ اپنا مفہوم پا جاتے ہیں اور یہ کوئی مفروضہ جنت بھی نہیں۔ عہد رسولؐ وخلفاء کے معاشرے کی تخلیق ایک تاریخی حقیقت ہے۔ مگر افسوس کہ یہ واحد تاریخی حقیقت ہے جس نے بعد کے ادوار میں کبھی اپنے آپ کو دہرایا نہیں۔

تعلیم و تربیت کے معیار دو ہی مقاصد کے لیے ہوتے ہیں۔ یا تو وہ لوگوں کو راہِ مستقیم کی ہدایت کرتے اور ان کی یقینی منزل کی نشاندہی کرتے ہیں یا پھر ان کو اتنے ذہنی آلات اور صلاحیتیں مہیا کر دیتے ہیں کہ وہ از خود مناسب ترین نتائج پر پہنچ سکے۔ استاد اول تو اللہ ہی تھا کہ اس نے بے سروسامان اور مجبورِ محض انسان کو زمین پر امانت عقل سے نوازا، استعمال عقل کا شعور بخشا، تجربات اور مشاہدات کی نگرانی بخشی، ماضی حال اور مستقبل کے تجربات اخذ کرنے کی صلاحیت بخشی اور کاروانِ حیات کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ ایسی تو کوئی بھی قوت نظر نہیں آتی جو واضح طور پر ابتدائی انسان کے احساس علم کو فروغ دیتی نظر آئے۔ تجربات تو جانور کو بھی نصیب ہوئے ہیں۔ مگر کیا وہ پھر اسے جبلی ذہانت کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے کہ کوئی جانور قرن ہا قرن کے انسانی استحصال کا توڑ دریافت کرنے کے قابل ہو سکا۔ کیا کوئی جانور اس قابل ہوا کہ انسان کا بوجھ اپنے سروں سے اتار کر ایک محفوظ تر دنیا تخلیق کر سکے۔ قطعاً نہیں۔ مگر انسان اس کے برعکس ایک غیر معمولی صفتِ برتری کی وجہ سے واضح سیادت حاصل کر گیا اور اس کے اس اقتدار کو دنیا کی کسی اور مخلوق نے چیلنج نہیں کیا۔

عجب بات ہے کہ خدائے بزرگ وبرتر عقل کی اس نعمت کو قرآن میں امانت کہتا ہے۔ وہ اسے صلاحیت نہیں کہتا۔ اور یہ بھی نہیں کہ یہ ہمیشہ سے انسانی ملکیت رہی ہو اور موت کے بعد بھی انسانی حکومت کا باعث بنی ہو۔ امانت کی کچھ ذمہ داری ہے۔ ایک ایسی نعمت جو دی گئی اور جو واپس لے لی جائے گی۔ اس کا دنیا پر کوئی مصرف تو ہوگا۔ امانت عقل کا ذاتی انسانی ملکیت نہ ہونا واضح ہے۔ علوم عمرانیات کی روشنی میں ابتداء کے انسان اور پرائی میٹ (Primates) سے پہلے کی انسانی جبلی تاریخ جانور اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتی۔ دہر میں بہت طویل عرصہ حضرت انسان ایسے رہے کہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھے۔ باقی مخلوقات کے ساتھ یہ بھی ایسی واحد خلیاتی مخلوق تھے۔ پھر بقول قرآن اللہ نے اسے دہرا خلیاتی وجود بخشا۔ منفی اور مثبت، داخلی اور خارجی، مرد اور عورت اور یہ ثنویت باقی مخلوقات کو بھی بخشی۔ جیسے پودوں کو پسٹل اور سٹیمن۔ تخلیق زندگی کا یہ طریقہ آگے بڑھتا ہوا جامد اور متحرک حیات کے تصور سے بدل گیا۔ واحدیت سے ثنویت پھر جمود وتحرک کی ثنویت۔ اس سے آگے بڑھتے ہوئے تخلیق میں ہمیں سکوت اور سماعت کی ثنویت نظر آتی ہے۔ کچھ مخلوقات کو بصارت اور سماعت عطا ہوئی۔ اس میں بھی انسان شامل ہے۔ مگر ابھی اسے کوئی تخصیص حاصل نہ تھی کہ اس سے جواب طلبی ہو یا کسی امانت کا شعور ہو۔ مدتوں زمانوں کے تسلسل میں جاندارانہ ہم آہنگی نظر آتی ہے اور انسان باقی تخلیقات سے مختلف نظر نہیں آتا۔

تجرباتِ پروردگار آگے بڑھے اور ہمیں اچانک تاریخِ حیات کے افسانے میں نیا

رنگ ابھرتا نظر آتا ہے۔ کسی غیر معمولی انوکھے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اچانک انسان سوچنے لگتا ہے۔ یہ اچانک پن انسان کے کسی علمی ادراک میں بھی نہیں۔ یہ دلچسپ حادثہ کب اور کیوں پیش آیا۔ اس کا جواب ابھی حضرتِ انسان کے پاس نہیں۔ وہ اپنی تمام تر آگہی کے باوجود یہ سراغ نہ پا سکا کہ اس نے کب سوچنا شروع کیا۔ سوائے مذہب کے اس کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ شاید انسانوں کی طویل تاریخ میں کسی بھی شئے کی ابتداء کا جواب اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں دیتا۔ اخروٹ اخروٹ کیوں ہوا اور بادام بادام کیوں بنا۔ تبدیلی تو شاید باپ بیٹے کے نقوش و عادات میں بھی آجاتی ہے مگر اتنا عظیم اور وسیع تنوع جو مخلوقات زمین میں بکھرا ہوا ہے' ایک ارب کے قریب مخلوقات زمین کی اقسام اور ہر مخلوق کسی نہ کسی مقصد حیات کی نشاندہی کرتی ہوتی' اتنا آسان نہیں' اس کی وضاحت پیش کرنا۔ اور حیات انسانی کے تمام متعلقہ علوم تھوڑی سی روشنی میں ایک قدم آگے بڑھ جاتے ہیں اور پھر ظن وتخمین کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔

پھر یہی انسان باشعور ہوا، بستیاں بسائیں، ذخائر تعمیر کئے' معاشرت کے انداز اختیار کیے۔ خیر وشر کے تصادم کا شکار ہوا۔ مکمل بربریت کا مظہر ہونے کے باوجود آدمیت کا پہلو بھی اس میں نمایاں ہونے لگا۔ اس خصوصی صفت سے جس نے انسان کو دوسری مخلوق سے ممتاز کیا۔ خلافتِ ارضی کا منصب تو طے ہو گیا مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کی قیمت کیا ادا کرنی ہے۔ نصف تاریخ حیات میں جو صفت ہماری نہ تھی' جس کی وجہ سے ہم نے زمین کی سیادت اور قیادت کا شرف حاصل کیا۔ کیا وہ صرف ہمارے انسانی تکبرات کو ہوا دینے کے لیے تھی۔ کیا وہ ایک ذاتی استحقاق تھا' جس کی ترقی وتربیت کے بعد ہم نے شجر وحجر، درند و

چرند کا استحصال کرتا تھا اور اس سے آگے بڑھتے ہوئے اختیار و اقتدار کے لیے، مال و اسباب کے لیے باہمی قتل وغارت کا بندوبست کرتا تھا یا اس کا مقصد کچھ اور بھی تھا۔ وہ مقصد تاریخ انسان میں بار بار دہرایا گیا' بار بار بھلایا گیا۔ وہ مقصد جو ہمارے غور وفکر کا نتیجہ نہ تھا بلکہ خارجی اور غیر انسانی القا اور الہام تھا' جس کے لیے ایک طویل فہرست ان پیغمبروں، صلحا اور اولیاء کی نظر آتی ہے۔ جنہوں نے اپنی زندگیوں کو تعلیم وتربیت انسان کے لیے وقف کیا۔ بار بار کسی بھولے ہوئے سبق کی یاددہانی کرائی اور جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ عقل ومعرفت جو تمہیں عطا ہوئی ہے' تمہاری ذاتی ملکیت نہیں بلکہ امانت ہے۔ اس امانت کا استعمال تم پر مباح وحلال ہے' مگر اس کے غلط استعمال کے نتیجے میں ایک طویل عرصہ ابتلا ہے اور اس کے صحیح استعمال میں لا انتہا زندگی کا اقتدار ہے۔

یہ امانت کوئی ٹیکس جمع کرنے کے لیے نہ تھی۔ اس کا معاوضہ زرومال اور اسباب کی صورت میں نہ تھا۔ امانت کی قیمت انسان کے مال واسباب کی محرومی نہ تھی اور نہ زمین بدری ہی کی شکل میں تھی۔ امانت کے استعمال کا نتیجہ واضح تھا۔ سوال نامہ مختصر اور جواب واضح تھا۔ پہلے سے متعین اور مقرر تھا۔ صرف اپنے اعتبارات اور شواہد سے اسے کنفرم (Conform) کرنا تھا۔ " ان ھدینه السبیل اما شاکرا و اما کفوراہ " (بے شک ہم نے اس کو راہ دکھائی (ہدایت دی) چاہے وہ شکر کرے یا کفر کرے)۔ کمرہ امتحان کا ماحول قابل رشک بنایا۔ نہ کوئی ممتحن نہ نگران' ہر عہد اور مقام اشارات اور منازل کی نشاندہی' مسلسل کتابوں کا ورود نسیان و کم فہمی دور کرنے کے لیے ہر قسم کی علمی اور عقلی مدد فراہم کی گئی۔ کوشش کی گئی اور کوئی کسر نہ چھوڑی گئی اور کوئی عذر باقی نہ رکھا گیا۔ شناخت پروردگار کو انتہائی قابل فہم، آسان اور قابل قبول بنایا گیا۔ پھر یہ کیا حادثہ ہے۔ کیا المیہ ہے۔ عقل ہونے کے

باوجود، علم ہونے کے باوجود، استاد ہونے کے باوجود، جملہ اشارات کے باوجود انسان ظالم اور جاہل ٹھہرا۔

جبلت اور عقلیت کی ثنویت میں بار بار جہالت کیوں جیتی۔ انسان کیوں ہارا۔ یہ جنگ بالآخر خسارے پر منتج ہوئی۔ معدودے چند اشرافیہ کے سوا صاحب عقل وفہم لوگوں نے ترقی کے مفہوم کیوں بدل دیے۔ عقل فتنہ ساماں کیوں ٹھہری، مکر وفریب، ظلم وناانصافی، جبر واستبداد کیوں طریقِ بشریت ٹھہرا۔ انسان نے امانت میں خیانت کی، حق عبادت ادا نہ کیا۔ کیا انسان اس شیطان سے بہتر ہے جس نے روزِ ازل نسلی اور جسمانی تفاخر کی بنا پر انسان کو حقیر جانا۔ کیا نفس انسان کے فریب نے تکبرات اور تمرّدکا وہی منظر تخلیق نہیں کیا۔ بلکہ اس سے بدتر شیطان نے کبھی اللہ کی کبریائی اور بندگی سے انکار نہ کیا اور انسان معبدِ نفس کا پجاری، زمانوں کے تواتر میں مسلسل اور متواتر نہ صرف انکارِ خدا پر قائم رہا بلکہ اپنی خدائی کے اقرار پر مُصر رہا۔ اس احساس ناشناس پر رحم کیا جانا چاہیے۔ کیا اس خودغرض حریصِ ذات پر بھی کوئی کرم ہونا چاہیے۔ مگر یہ کہ ''اللہ جہانوں کا پالنے والا، رحمٰن اور رحیم ہے''۔

صدیوں سے نفسِ انسان پر غور وفکر جاری ہے اور جب سے نفس کی آگہی، اللہ کی پہچان ٹھہری۔ قافلۂ عشق کے مسافروں کو اس طلسم ہوش ربا کی کشاد میں نجات کی تلاش رہی۔ خودشناسی، خوش فہمی، شناختِ ذات، مختلف ناموں سے اس چیستان کی ادھیڑبُن جاری رہی۔ بہت ہی کم لوگ اس کے معانی تک رسائی پا سکے۔ اور وہ جو اس سے خوفزدہ تھے، آگہی پا کر اور خوفزدہ ہوئے۔ جاننے والوں نے اس کو ذاتِ انسان کے ایسے سفاک دشمن کی طرح شناخت کیا جسے حلال وحرام، خیر وشر، فتنہ وامن، غربت وامارت، جنگ وامن، مثبت ومنفی ہر صورت میں انسان پر حاوی پایا۔ فاتحین کے جاہ وجلال میں اور مفتوحین کی حالتِ زار میں، علم ودانش کی سرفرازیوں اور جہلاء کے تعصبات میں، امراء کی طلب وجاہت اور غرباء کی عذرداریوں میں، ادیبوں کی لذتِ تحریر اور بے ادبوں کی گستاخ زبانوں میں، حسن وعشق کی داستانوں اور جنسی ضروریات کے پس منظر میں، کہاں کہاں پہ یہ نفسِ خراب کار نہیں۔ مگر یہ تھا کیا! اور یہ ہے کیا! معاملہ اتنا پیچیدہ نہیں تھا۔ برس ہا برس کے جانورانہ خصائل نے دورانِ زمانہ میں انسان کے باطن میں مستقل جگہ بنالی تھی۔ بقا اور دفاعِ ذات سے جو زندگی شروع ہوئی، وہ پیچیدہ تر نظام معاشرت اور معیشت میں بھی اپنے خصائل کو ترک نہ کر سکی۔ تمام

انسانی نظام چاہے کتنے ہی ہمدردانہ نظر آتے ہوں، بنیادی طور پر کسی نہ کسی حسِ تسکین کے معاون رہے۔ اگرچہ میدانِ جنگ ومسابقت بدل گئے اور وہ جنگ جو انسان اور جانور کے درمیان تھی ختم ہوگئی مگر ہوموسیپین (Homosapian) کی باہمی مسابقت کی جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ انسان مجموعی طور پر زمین پر فرد تھا اور دوسری اقسامِ حیات کے مقابل میں اپنی انفرادیت کا قائل اور حامل تھا۔ رحم وکرم کے ساتھ تمرد وتفاخر کے جذبات محکم ہوتے گئے۔ بقا بحلِ حیات ہے۔ کاروانِ نمل میں سلیمانؑ نے جو حسِ بقا پائی' وہ فیلانِ مست کے گروہ بھی اس طرح موجزن اور اپنی متنوع اور متلون اقسام کے ساتھ اوصافِ انسان میں بھی شامل تھی۔ بقائے حیات سے نفسِ انسان نے ابتداء کی۔ علم وفکر نے صرف اس میں طریقہ کار کا اختلاف پیدا کیا۔ اس سے نجات حاصل نہ کی۔ وہ تمام علوم وفنون جو انسان نے کسبِ حقیقت میں پروان چڑھائے اور وہ طریقے جو تہذیب انسان کی ترقی کے لیے اختیار کیے۔ ان کا مرکز ومحور بھی آسانی، کشادگی اور تعمیر نفس ہی تھا۔ نفس نے انسان کے لیے اپنے لیے ہمدردی اور انس کے ذرائع تخلیق کیے کہ یہ انسانیت ہی سمجھا جانے لگا۔ جو چیز شعورِ ذہن اور جزوِ زندگی بن کر رگ وپے میں متحرک ہوا' سے انسان اپنا دشمن کیسے سمجھ سکتا تھا۔ باوجود تلقین اور رشد وہدایت کے یہ کام بہت ہی مشکل تھا کہ انسان اپنا دشمن آپ بن جاتا۔ یہ جنگ کس کے لیے لڑی جاتی اور اس کا انعام کیا ہوسکتا تھا۔ خدا کی دوستی اور نظر سے اوجھل ایک جنت!

نفس کی بنیاد اسبابِ ظاہری پر ہے۔ یہ انسان کو حواس خمسہ کے ذریعے قائل کرتا ہے۔ خدا اور عقل تو بہر حال حواسِ خمسہ سے دور' قلب ونظر کی حدود سے ورا' ایک ایسا سراب اور عقدہ تھا جو موت سے پہلے کبھی آزمایا نہیں جاسکتا تھا۔ نفس انسان کا اعصابی نظام ہے،

اس کا لڑکپن ہے، اس کی جوانی اور بڑھاپا ہے۔ نفسِ انسانی ضروریات کا پیکٹ ہے۔ بنیادی جبلتوں کا ایک دفاعی نظام جو عہدِ قدیم سے اتنا طاقتور ہو چکا ہے کہ تمام علم و معرفت بھی اس کے مدافعاتی حربوں کا سامنا نہیں کر سکتے۔ بقائے حیات کی خندق میں گھسا ہوا یہ جنگجو علم و عقل کے تمام حملوں سے بچاؤ کی تدابیر جانتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ہتھیار اپنے محکوم کی ہمدردی اور انس ہے۔ یہ وہ جنگ ہے جو انسان جیتنا ہی نہیں چاہتا۔ اس کے مقتول کا کوئی قصاص نہیں، کوئی دیت نہیں۔ بقول ربِ کریم نفسِ انسان کی صورت میں اللہ نے اپنا سب سے بڑا دشمن تخلیق کیا۔ انسان کے باطن میں اسی دجال کی حکمرانی ہے۔ اس کی تخلیق کاری بھی تباہ کاری ہے۔ یہ تم میں تو ہے اور مجھ میں، میں ہوں۔ یہ انفرادیت ہے، تقسیم کار ہے اور ہر شخص میں شخصیت ہے، عالموں میں ان کے علم کا مظاہرہ ہے، جاہلوں کا خناس ہے، زاہدوں میں تقدس اور زہد ہے، ادیبوں میں شہرت اور حکمرانوں میں طلبِ جاہ ہے۔

نفسیات دانوں نے اس جبلّی پیکٹ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انسانی رویوں کے اصول ڈھونڈے، ان کے احساس کو کمتری اور برتری میں پرکھا۔ کمپلیکس (Complex)، فوبیاز (Phobias)، نیوراسس (Neurosis)، سائیکوس (Psychosis)، اوہام اور وساوس، جنون و مراق، کیا کچھ نہ ذہنِ انسان سے نکالا۔ خوف اور حزن کے بنیادی اسباب تلاش کیے، مگر کیوں؟

ان کا مقصد نہ خدا کو جاننا تھا' نہ خدا کے لیے نفس ہی کو جاننا۔ وہ تو بس ایک منفعل اور بے کار، حرماں نصیب، شکست خوردہ، نفس کو دوبارہ فعال' منضبط اور طاقتور کرنا چاہتے

ہیں' تا کہ بقا کی جنگ میں دوبارہ شریک ہو سکے۔ نفسیات دانوں اور صوفیاء میں بس ایک ہی فرق ہوتا ہے۔ وہ نفس کو نفس کے لیے جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور صوفیاء نفس خدا کی خدمت میں ایستادہ کرنا چاہتے ہیں۔ نفس اور ہوا کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خواہش اور ہوا نفس کی ترجیحات مرتب کرتے ہیں۔ شیطان کی ہم رکاب اور ہم جلیس خواہشات نفس کے موسم میں تغیر پیدا کرتی ہیں۔ نفس قبضۂ غاصبانہ کا حریص اپنی ملکیتوں کا بخیل اور دوسروں کی املاک کا غاصب ہے۔ عفو و درگذر تو درکنار اس کے تمام مہذبانہ رویے، کیموفلاج (Camouflage) اور دفاعی حربے ہیں۔ یہ نائٹرس شہر نا پُرساں کا حکمران ہے۔ اس سے رحم کی اپیل اس کے تمرّد کو ہوا دینا ہے۔ شکست خوردگی میں یہ خطرناک اور اذیت پسند ہے۔ اس کی تمام تر مخالفت اس اجنبی روح سے ہے جو دیارِ غیر سے آ کے اس کے ہاں مہمان ہوتی ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ وہ کبھی واپس نہ پلٹے۔ روح کی ترجیح واضح اور افضل ہے۔ وہ خدائے واحد کا شعور رکھتی ہے اور باوجود ناسوت کا قیدی ہونے کے اس کی آرزوئے بقائے ربانی نہیں جاتی۔ نفس اس کی یاد اور آرزو کا دشمن چاہِ بابل میں گرفتار فرشتوں کی طرح روح کو پابندِ جسم و ذہن کرنا اس کا بنیادی مقصد ہے۔ آدمیت اور انسانیت کی اس جنگ میں یہ شیطان سے معاونت طلب کرتا ہے اور ملائے اعلیٰ کی طرف جانے والے راستے مسدود کرتا ہے۔ صدیوں کے تجربات کا حامل ہونے کی وجہ سے ایک ہولناک مجموعی طاقت ہے جس پر کوئی فرد بھی بغیر خدا غالب نہیں آ سکتا۔ جیسے یوسفؑ نے کہا، نفس سے کون آزاد ہے۔ نفس تو ہمیشہ برائی کا حکم دیتا ہے۔ ہاں اگر اللہ رحم فرمائے تو روح اس بے رحم تاوان گیر کے تسلط سے بچ نکلے۔ اللہ نے اس دشمن سے اعلانِ جنگ فرمایا ہے۔ کہا جو مجھ سے محبت اور انس رکھے گا' نفس کے ہر اشکال اور ہوا کی ہر لہر کی مخالفت کرے گا۔ نفس اپنے مردوں کو ہر عصر میں نئے

کفن دیتا ہے۔ اولمپس کے دیوتا نہ سہی، برہما شیوا وشنو نہ سہی۔ عشتار اور آئی سس نہ سہی' تجرید کے نمونے سہی۔ اجسام کی عبادت نہ سہی، عادات ومشاغل کی تقریبات، شراب وسُکر کی مفاہمت سہی، انعام اور ادبیت کی آمیزش سہی۔ظلم وستم کو تہذیب' ذرائع ابلاغ کے مکرو فریب کو فراست، فواحش کی تقریبات کو آرٹ، بت پرستی کو فنون لطیفہ، خیالِ خدا کو رجعت پسندی قرار دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

کیا عجب ہے کہ شاعر جب تعریفِ شعر سن کر مسکرائے اور ادیب کسی تقریب تعارف پر نظر میں چمک لائے، سیاست دان ہجوم کے پُرشور نعرے سن کر ہاتھ اٹھائے، عابد اپنے تقویٰ کی تعریف میں انکسار سے سر ہلائے، جنگجو اپنی دلاوری کے قصے سنا کر سینہ پُھلائے تو نفس خراب کار کو اپنا قریب ترین ہمسایہ پائے۔ اس کا آنا خدا کا جانا ہے۔اس کی قربت خدا سے دوری ہے۔ جنت اور جہنم کا بُعد ہے۔شیطان ورحمٰن کا تفاوت ہے۔اہریمن اور اہورامزدا کے فاصلے ہیں۔نور وظلمات کا تصادم ہے۔

شطرنج کے مہرے اگرچہ کم ہوتے ہیں مگر ان کی چالیں ایک ارب سے بھی زیادہ ہو جاتی ہیں۔نفس بھی اگرچہ معدودے چند بنیادی حیوانی اور انسانی مشترک جبلتوں پر مبنی ہوتا ہے۔مگر اس کا باہمی جبلی اشتراک (Interplay) ان گنت ہو جاتا ہے۔ایک صوفی کا قول ہے کہ آج تک مجھے مقاماتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور فریب ہائے نفس کی کبھی سمجھ نہیں آسکی۔تنہا جبلت کو بھی اپنی کارفرمائی کے لیے باقی جبلی محرکات کا اشتراکِ عمل چاہیے ہوتا ہے۔خواہش اس کا حرکی عنصر (Drive Motive) ہے۔ انسان کی تعلیم کے ساتھ اس کا

عمل پیچیدہ تر ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بنیادی اعتدال کے کنٹرول سسٹم سے باہر ہو جاتی ہے اور تخریب کاری ذات کا معمول بن جاتی ہے۔ نفس جھوٹا نہیں ہوتا۔ یہ اپنے جھوٹ میں سچا ہوتا ہے۔ اس کی فطرت سائنسی اور لگی بندھی ہے۔ اس کے اصول واضح ہیں۔ حس بقا اخلاقی اقدار کو تسلیم نہیں کرتی۔ اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے اسے جن معاونین کی ضرورت ہے، وہ ازل سے اس کے ساتھ ہیں۔ نفس کے متبعین میں کوئی غدار نہیں۔ حسد، کینہ، بغض، غیبت، غیض و غضب، شہوات بلاتفریق نسل و مذہب ہر جگہ یکساں عمل پذیر ہیں۔ ان کی شدت اور قوتِ استعداد میں کمی ہو سکتی ہے مگر ان کی نیت مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان کا اشتراک قتل تک نہ پہنچے مگر حسد میں رحم کی کوئی کیفیت نہیں ہوتی۔ خدائی صفات کے خلاف یہ انسانی صفات بندگی سے معذور ہیں۔ ان کا عمل محدود ہے اور نظر غیر آفاقی۔ ایک اہم بات وہ وقفہ سکینت ہے جو جبلتوں کی عمل پذیری میں بہت ہی کم ہوتا ہے۔ جنگل کی آگ کی طرح ہر جبلّت فوری اشتعال اور تحرک کا مظاہرہ کرتی ہے اور ٹھہرنے کا کوئی وقفہ نہیں دیتی۔ انا اور تمرّد اور عزتِ نفس اس کی ہوائیں۔ عزتِ نفس شائد سب سے مشکوک اور بحث طلب ہے۔

کیا لطیفہ ہے کہ جملہ انسانوں میں عزت نفس ایک معتبر صفت سمجھی جاتی ہے، مگر دراصل یہ آسودگی اور احساس کمتری کی بنیادوں پر استوار شیشے کا محل ہوتا ہے۔ عزت نفس کے لیے ہمارے پاس کوئی معیار نہیں۔ اس کی بنیاد ہمارے بچپن سے لے کر عمرِ آخر تک کی کمی وبیشی کی تمام پیچیدگیوں پر ہوتی ہے۔ نفس جو مزاحمت اور موافقت اپنے حالات کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ وہی عزت نفس کا تخلیقی مواد بن جاتا ہے۔ ایسے حالات میں عزت نفس سنجیدہ

نفسیاتی مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔ چہ جائیکہ اسے قابل وقعت قدر قرار دیا جائے۔ ابتدائی ادوار میں نفس قابل فہم ہے اور کم تعلیمی میں اسے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر جوں جوں انسانی تعلیم اور مہارتیں اور رجحانات بڑھتی ہیں، نفس بھی پیچیدہ تر ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس کی تکنیکی صلاحیتیں گنجلک ہوتی جاتی ہیں۔ کسب علوم وفنون نئے نفیس تر اور مبہم اور پیچیدہ احساس تخلیق کرتا ہے اور نفسی ذاتی پسندیدگی کے ساتھ مل کر نفس کو احتساب سے بالا کر دیتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں آدمی کے تمام روحانی احکام و افکار بھی نفس کے استحصال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عذر تراشی کی مہارت نفس سے زیادہ کسی میں نہیں۔ خیر وشر کی تمام اقدار کو استعمال کرتے ہوئے تفاخر، برتری، نفرت وجود وخیال، نمائش پسندی، جاہ طلبی، اہمیتِ ذات، عقلی اور علمی ترفع، ہم خیال مصاحبت ذوق اور زبان کا سراب، مخلوق کے مابین فاصلے کا تعین، ذاتی محبوبیت کا تصور، مالی آسودگی، تحیّر کی نمائش، مخصوص فنون کے ساتھ مخصوص شخصیاتی رویے تمدن اور تہذیب کے ہر انوکھے پن میں نفس انسان اپنی کارگذاری دکھاتا ہے، جسے تمام تر دانشوری کے باوجود جاہ طلبی پورے مغربی فکری ماحول میں فطری نتیجہ خیال کیا جاتا ہے اور اپنی کارگزاری اور کاریگری میں داد وصول کرنا اور اس کے لیے جد وجہد کرنا اعمالِ خیر میں سے ہے۔ مشرق میں تمام مراتب کے القابات اس کی واضح قسم ہے۔ کوئی عالم دین، کوئی مفکر اور کوئی ہنرمند ان القابات کا برا نہیں مناتا جو مبالغہ اور تعریفات پر مبنی ہوتے ہیں اور جو عقیدت مندوں کے نفسی مبالغے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

سنکی (Cynic) اور صوفی (Mystic) ان نفسی تجاوزات پر استہزا کی نظر رکھتے ہیں، مگر سنکی طنز وتشنیع کے باوجود اپنے آپ کو اس جلن اور کیفیتِ حسد وغیض سے نہیں بچا

سکتا جو نفس کے ردِعمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس صوفی اپنی کیفیات کو ایک بہتر فلسفہ حیات، علمی انکسار اور معتدل کیفیات سے زائل کر دیتا ہے۔ سنکی نفس کی مخالفت ایسے بیمار کی طرح کرتا ہے جس کو کوئی صحت مند اچھا نہیں لگتا اور صوفی خدائی انس اور محبت کے سائے میں اپنی کسی فوقیت کو ذاتی نہیں سمجھتا اور خدا کا انعام سمجھتے ہوئے فوقیت و برتری کے ہر تصور کو ادھار سمجھ کر کبر و غرور سے بچ نکلتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ قرض کی خدائی لحاتی اور ناپائدار ہوتی ہے۔

نفس کے لیے زہر قاتل حسِ مزاح ہے جو اس کے تفوّز اور تفوّق کو ہم سطحِ زمین رکھتی ہے۔ حسِ مزاح تو کبھی نفس کا آلہ کار بن کر دوسرے لوگوں کی خامیوں اور خرابیوں سے محظوظ ہوتی ہے اور کردار اچھالنا، سکینڈل تخلیق کرنا، ذاتیات کا تجسس، تحقیرِ غیر سے تلذذ حاصل کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے، مگر جب یہ اپنی ذات کی طرف رجوع کرتی ہے تو ہمدردیٔ ذات کا طلسم توڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور خود فریبی اور ارتکازِ ذات میں مورچہ زن اس نفسِ پُرکار پر مسلسل حملہ آور ہوتی ہے۔ جو شخص اپنے اوپر ہنس سکتا ہے، وہ اس شخص سے ہزار ہا درجہ بہتر ہے جو دوسرے پر ہنستا ہے۔ وہ اپنی حقارتوں میں سربلند رہتا اور اپنی وجاہتوں میں باخبر اور نگران، مگر نفس کا یہ نگران خیر و شر سے بالا، عزت و ذلت سے بے نیاز، کمی اور بیشی میں معتدل، صرف خدا ہی کی مکمل تائید سے پنپ سکتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ فقیر کا منصب آرزو نہیں ہوتا اور عرصۂ آرزو طویل نہیں ہوتا۔ وہ صلاحیتوں کے مناصب اپنی طرف موسوم نہیں کرتا۔ ادھار پر حق ملکیت نہیں جتاتا۔ عرصہ حیات کو مستقل نہیں جانتا اور علم کا اول و آخر صرف حصول اعتدال سمجھتا ہے۔ یہ حسِ مزاح اسے اپنے ساتھ ہمدردی

سے روکتی ہے اور دوسروں کی خامیوں کو قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ ہر انسان کو اس کے علمی استحقاق کے مطابق برداشت کرتی ہے۔ عجلت، بے قراری، حزن وملال کی جو کیفیات عصرِ حاضر پر محیط ہیں' اس کی واحد وجہ یہ خود احتسابی سے گریز، ہمدردی ذات، نفس انسان کی آسانی کی خواہشات اور بندگی کی بجائے خدائی کی آرزو ہے۔

زندہ اور فعال خدا سے انکار نہ بھی ہو تو بھی اس کی تسلیم، ہدایت اور نگرانی سے گریز کی تمام کوششیں ہمیں منتشر ذاتی اور خود غرضانہ افکار اور منفی طرزِ زندگی کی طرف لے جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ قتل وغارت، بے چینی، بے خوابی اور قوتِ حافظہ کا بحران ہے' جس میں دورِ حاضر مبتلا ہے۔

نفس فریب کار نہیں بلکہ بنی آدم کو جو مراحلِ امتحان پیش ہیں وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک جامد (Static) اور دوسرے متحرک (Moving and Shiftable)۔ ایک ٹیکنالوجی نفس میں مرتکز ہے اور دوسری شیطان کی سربراہی میں فعال ہے۔ نفس کی ٹیکنالوجی اس لیے جامد ہے کہ مقاصد کی جدت نہیں اور نہ اس طریقہ کار ہی کی جدت ہے۔ ازل سے ابتدائے انسان کے ساتھ نفس نے زندگی، جاوداں کی آرزو کے ساتھ انسان کو بہکایا اور شیطانِ رجیم نے اس آرزوئے نفس کو جنت کے مکانی اور زمانی پہلو میں تحرک دے کر آدم کو اللہ کی ہمسائیگی سے دور کر دیا۔ نفس وہ بنیادی زمین فراہم کرتا ہے' جہاں شیطان شرارت کی تخم ریزی کرتا ہے اور پھر ایک شہوتِ خبیثہ تناور درخت بن جاتی ہے۔ یہ ایک زہریلی گھاس ہے جو عقل ومعرفت کی تو نا فصل کو برباد کر دیتی ہے۔ نفس کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ ذہنِ انسان ہے۔ رب کریم کے احکام

اور نصائح سے کم علمی اور تغافل ہے۔ اللہ ایک عظیم اور برتر استاد کی طرح جو اختیار انسان کو دینا چاہتا ہے' اس میں جبر سے کام نہیں لیتا۔ اس کے لیے یہ آسان تھا کہ تمام انسان ہدایت یافتہ ہوتے۔ کسی کو مجالِ گستاخی نہ ہوتی۔ حوصلۂ انکار تو درکنار جرأتِ سرتابی کا شائبہ بھی نہ ہوتا۔ مگر یہ مقصدِ تعلیم صحت مند نہ ہوتا۔ تعلیم کا مقصد ہی صلاحیتِ انتخاب پیدا کرنا ہے۔ کسی کو صلاحیت انتخاب دے کر اس پر فیصلہ عائد کرنا ناانصافی ہے اور اللہ یقیناً ناانصاف نہیں۔ جہاں انسانی ذہنی آراستگی کے لیے بے شمار امدادی اور ترغیباتی طریقے بہم پہنچائے گئے' وہاں نفس کے اندر بھی احساس زیاں کا تأسف رکھا گیا۔ کبھی نہ کبھی انسان کو احساس زیاں اور توجہ سے آشنا کر کے اس کو دوبارہ صحت اور اعتدال کو پلٹنے کا موقع دیتا ہے۔

مختصر یہ تمام افسانہ انسان اللہ کے نزدیک تین ہی درجات پر مشتمل ہے۔ غلطی یا گناہ، احساسِ گناہ یا توبہ اور مغفرت ----- پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جس کو اپنی خطا کا علم ہو' توبہ کی قبولیت کا بھی، پھر بھی وہ اپنا خسارہ پورا نہ کرنا چاہے۔ یہ وہ ظلم و جہالت ہے جس کی طرف اللہ نے امانتِ عالیہ میں اشارہ کیا ہے۔ جسمانی مشقتوں سے نفسِ انسان کو اذیت دے کر اسے درستگی کی طرف مائل کرنا، کم از کم اللہ کے نزدیک معتبر نہیں۔ مشقت بذاتِ خود ایک عداوت بن جاتی ہے اور اپنے مخفی تکبرات رکھتی ہے۔ جان کو ہلاکت میں ڈالنا ایسا مرغوب فعل نہیں کہ جس کے نتیجہ میں اللہ کی ہمسائیگی یا قرب نصیب ہو۔ اس طرح تو کولہو کا بیل سب سے بڑا صوفی اور خدا شناس ٹھہرے گا۔ نفس ذہنی جبریت کو جھوٹے دعاوی میں ملوث کر دیتا ہے اور جبریت کو بھی شیطنت کا ایک جزو بنا دیتا ہے۔

اللہ بہر حال انسان کو جانورانہ تخلیقات سے بہتر سمجھتا ہے اور عقل کو تخلیقات میں فوقیت دیتا ہے۔ غور وفکر ہر انسان کو آزادانہ انتخاب کی صلاحیت عطا کرتے ہیں۔ نفس جہاں عارضی ترجیحات کے دام پھیلاتا ہے، پہچان فطری اور معتدل کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔

نفس کی ایک کمزوری ہے جس سے اہلِ عقل ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہی وہ کمزوری ہے جس سے اس کو معتدل کیا جاتا ہے یا اس کے عادات کا توڑ اور روکا جا سکتا ہے۔ نفس کو ہر خواہش سے بڑھ کر اس کا تجسس ہے۔ یہ ہمہ وقت سونگھنے، چکھنے اور جاننے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ حیرتوں کی اسے تلاش رہتی ہے۔ نئے پن کا حریص ہے۔ انفرادیت کا شائق ہے۔ یہ شوق اسے تعلیمِ دنیا کو بھی لے جاتا ہے اور کبھی کبھی اسے خدا کے راستے پر گامزن کر دیتا ہے۔ اس کے تجسس کو استعمال کر کے تعلیم وتربیت میں اضافہ کر کے اسے عمومی اور کم تعلیم یافتہ لوگوں سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس وحشی درندے کی طرح ہے جس کو سدھانا کارے دارد مگر عمومی طور پہ مظاہرہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ شیر، بھیڑیا، کتا، سانپ بھی پالتو جانور کی طرح رکھا جا سکتا ہے۔ سرکس کے جانور کی طرح سزا اور جزا کے عمل سے اس میں مخصوص تہذیب جنم لے سکتی ہے۔ آغازِ تربیت میں نفس خواہش کے باوجود اپنی ابتدائی خصلتوں کے تحت بغاوت بھی کرتا ہے اور بار بار اپنی عادات کو دہراتا ہے۔ ابتدائے تربیت میں اس کا مقصد کسی بہتر اور برتر خیال کا حامل نہیں ہونا چاہیے، مگر تجسس اسے تحقیق اور محنت پر آمادہ کرتا ہے۔

تربیت اور نئی عادات کے اختیار کے بعد یہ اپنے آپ کو منفرد اور ممتاز کرنے کے